مُردہ آنکھیں زندہ ہاتھ

احمد سلیم

سارا شگفتہ کی یادیں، باتیں، نظمیں اور خط
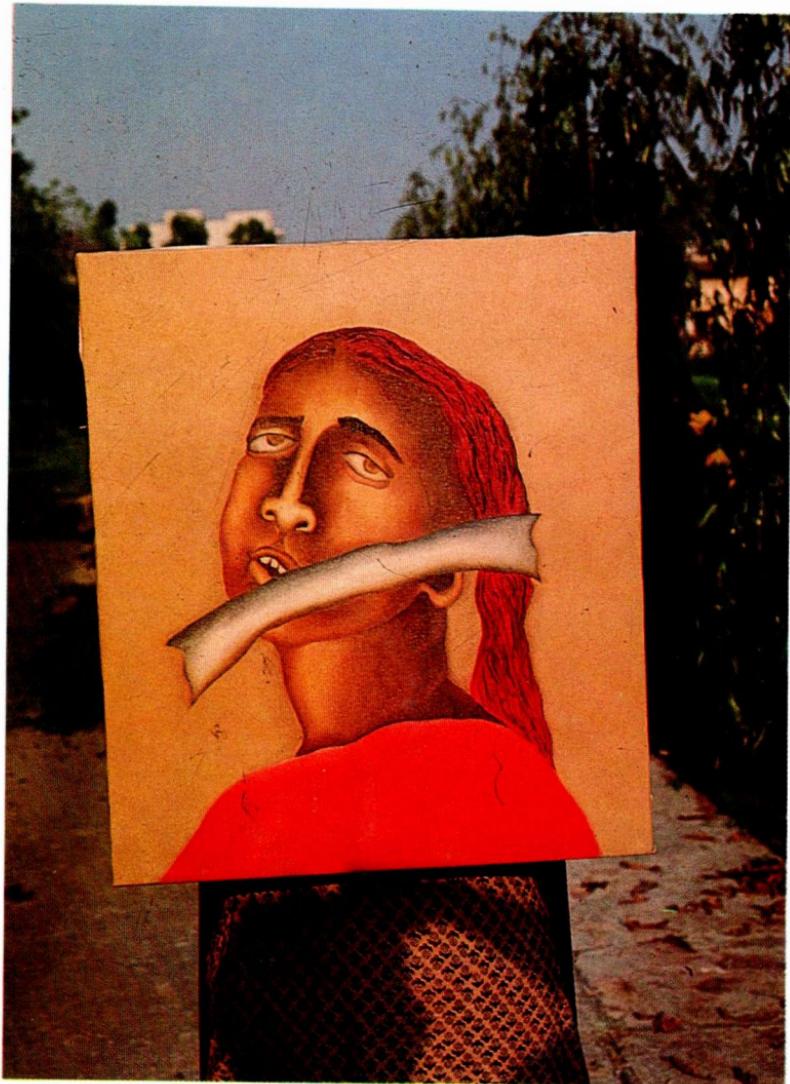
نگارشات لاہور

مردہ آنکھیں زندہ ہاتھ

احمد سلیم

نگارشات
میاں چیمبرز۔ ۳ ٹمپل روڈ لاہور

۱۹۸۹

مصنّف — احمد سلیم
ٹائٹل — اقبال حسین کی پینٹنگ
ناشر — آصف جاوید
پرنٹر — شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت — ۶۰/- روپے

سنگِ مرمر کے پھولوں میں
مُردہ آنکھیں، زندہ ہاتھ
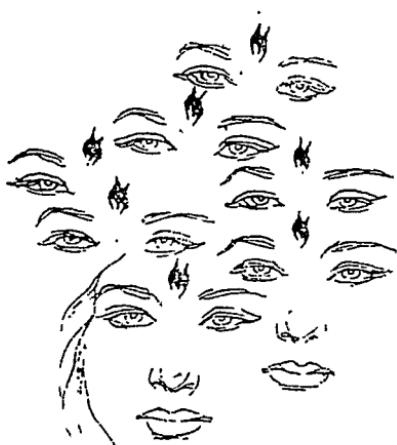
پہلی بات ہی آخری بات تھی

چار سال ہونے کو آرہے ہیں میری کتابوں میں ایک کتاب آنکھیں رکھی ہوئی ہے۔ ایک سوالیہ نشان کی طرح' کہ کب میں اس کو دیکھوں اور اس میں موجود سوالوں کے جواب دوں۔ "آنکھیں" کی شاعرہ سارہ شگفتہ نے کہا تھا "اس سے پہلے کہ میں مٹی میں رچ جاؤں' میرے ساتھ انصاف کرنا" میرا اس سے تعارف اس وقت ہوا جب وہ مٹی میں رچ چکی تھی لیکن مٹی میں رچنا اور خاک ہو جانا دو مختلف عمل ہیں۔ سارہ خاک نہیں ہو سکی اس لئے "آنکھیں" مجھ سے سوال کرتی ہیں کہ میرا قلم کیوں خاموش ہے۔ آج میں اپنے قلم کی خاموشی کی مہر توڑ رہی ہوں۔ اس جملے کے ساتھ کہ مجھے سارہ شگفتہ سے اختلاف ہے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس سے اختلاف کرتے ہوئے اس کے ساتھ انصاف کیسے ہو سکتا ہے؟

۱۳ جولائی ۸۵ء کی گرم دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میں دفتر سے اٹھنے کی تیاری کر رہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میرے عزیز دوست جمیل زبیری نے مجھے کہا کہ آج شام آرٹس کونسل میں سارا شگفتہ کی کتاب "آنکھیں" کی تقریب رونمائی ہے میں ان کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کروں۔

"کون سارا شگفتہ؟"

"بھئی پچھلے سال جس کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا' ریل کے نیچے آکر' کچھ لوگ اسے خودکشی کہتے ہیں"

مجھے یاد آگیا تھا "اچھا تو اب لوگ مرنے کے بعد پوجنے کی رسم پوری کر رہے ہیں"؟

جمیل زبیری ہنس پڑے "پھر کیا پروگرام ہے؟"

"چلئے چلتے ہیں ہم بھی تماشائے اہل کرم بلکہ اہل قلم دیکھنے چلتے ہیں"

آرٹس کونسل کے ہال کی سب سے پچھلی نشستوں پر ہم لوگ بیٹھے تھے تقریب ابھی شروع نہیں ہوئی تھی' ایک صاحب نرم مسکراہٹ کے ساتھ جمیل زبیری کے پاس آئے۔ انہوں نے تعارف کرایا یہ احمد سلیم تھے۔ یوں ۱۳ جولائی کی وہ شام اور سارا شگفتہ دونوں میرے لئے اہم ہو گئے۔ احمد سلیم سے ملاقاتوں اور مشترکہ کاموں کے سلسلے ایسے بڑھتے گئے کہ آج ہم دوستی اور ذہنی ہم آہنگی کی ایک نہایت اعلیٰ' نفیس اور ستھری سطح پر کھڑے ہیں جس کی مثال ہماری سوسائٹی مین شاذ و نادر ملتی ہے۔

ابتدا ہی سے سارا شگفتہ ہمارے درمیان موضوع گفتگو بنی رہی۔ جو کچھ مجھے سارا کے بارے میں معلوم ہوا

تھا وہ اس دنیا کی کہانی نہیں لگتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے دوستوں نے اس کے بارے میں بیان کرتے ہوئے مبالغہ سے کام لیا ہے

"سارا شگفتہ کو لوگوں نے اپنے مفادات کیلئے استعمال کیا اور مار ڈالا"

"سارا دوستوں کو قرضہ دے کر خود بھوکی رہ جاتی تھی"۔

"لوگوں نے اسے شاعرہ سمجھ کر مقام دینے کی بجائے عورت سمجھ کر ہاتھ صاف کرنا چاہا"

پھر خود اس کی کتاب کے آخری صفحات میں جس میں اس نے اپنے بارے میں لکھا تھا۔ وہ سب ناقابل یقین اور نامکمل تھا ادھر احمد سلیم کا اصرار تھا کہ میں ان کی اس کتاب کا دیباچہ لکھوں۔

پھر ایک بار سارا کے دوستوں نے بتایا کہ سارا نے کئی بار فاقوں سے تنگ کر اپنے جسم کو بھوک کے خلاف ڈھال بنایا۔ بحیثیت عورت اور انسان ہونے کے میرے لئے یہ سب کریہہ انگیز تھا۔ میرے اعتراض پر سارا کے دوست جذباتی ہو کر مجھ پر چیخ پڑے

"گوہر تم نے بھوک نہیں دیکھی تمہیں نہیں پتہ فاقہ کیا ہوتا ہے۔"

"میں بخوشی بھوک دیکھنے اور فاقہ کرنے کو تیار ہوں مجھے یقین ہے کہ بدترین فاقے کے بعد بھی میں گندگی کی اس دلدل میں گرنے کو تیار نہیں ہونگی۔ جسم اور ضمیر کا سودا کرنے سے بہتر سمجھونگی کہ ذہن اور قلم بیچوں۔" میرا جواب تھا

کسی نے مزید بتایا کہ سارا شگفتہ تو تمام دن آرٹس کونسل میں بیٹھی سگریٹ پیتی رہتی تھی اور اکثر نشہ میں نظر آتی تھی۔ یہ بات پھر اس کی مظلومیت بھری داستان کا تاریک کونہ بن رہی تھی۔ تنگ آکر میں نے اس کی کتاب کے ایک ایک حرف کو غور سے پڑھا' اس کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی معلومات حاصل کی اور جو کہانی میرے سامنے بنی وہ کچھ یوں تھی۔

سارا شگفتہ کی شادی اس معاشرے کی بہت سی شادیوں کی طرح چھوٹی موٹی یا ممکن ہے بڑی بڑی الجھنوں کا شکار تھی۔ تین بچوں کی ماں کیلئے جو کہ زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں تھی' شوہر کو چھوڑنا آسان نہیں تھا۔ ایسے میں اس ملک کے ایک مصروف شاعر نے' جو کہ اس کے شوہر کا دوست تھا جانے کیوں اس المیہ کا ایک اہم کردار بننا قبول کر لیا۔ سارا اس شاعر کو اس خیال سے کہ وہ دوست ہونے کے ناطے اس کے شوہر کو سمجھائے گا اپنی الجھنیں اور شوہر کی شکائتیں بتاتی تھیں۔ اس شاعر نے اچانک سارہ کو اپنی شاعری اور پڑھی لکھی شخصیت کے سحر میں گرفتار کرنا شروع کر دیا' یہاں تک اس کے اصرار پر سارہ نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی' اور شاعر

صاحب سے شادی کر لی۔ زندگی کا رخ بدل گیا۔ اب سر سے چھت اور منہ سے نوالے چھن گئے۔ اس بات میں کتنا سچ ہے کہ بقول سارہ "گھر میں روز منطق پکتی تھی اور ہم فلسفہ کھاتے تھے"۔ سارہ کا یہ بیان ثابت کرتا ہے کہ اس میں پہلے شوہر گلگھر کسی بھی حوالے سے بہتر زندگی کی تلاش میں چھوڑا تھا اور اب وہ مزید بدتر حالات کا شکار ہو کر اعتراف کر رہی تھی کہ منطق اور فلسفہ پڑھنے سننے اور زندگی میں شامل کرنے کیلئے تو ٹھیک ہے' لیکن ضروریات زندگی بہر حال اپنی جگہ مسلم ہیں۔

وہ فاقے کرنے کو تیار نہیں تھی' اس کے عوض جسم بیچنے کو تیار تھی۔ اس ی لئے اس نے اس شاعر سے بھی چھٹکارہ حاصل کر لیا۔ اور پھر خود بھی شاعری شروع کر دی۔ جس کے بارے میں آج تک لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ اس نے لکھا وہ شاعری نہیں تھی۔ ہذیان تھا' پاگل پن تھا' بکواس تھی' فحاشی تھی' وغیرہ مگر یہ سب کہنے والے خود مختلف ڈھروں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہذیان اور پاگل پن کی اصطلاحیں ان کی تھیں جو سارہ کی تخلیقی صلاحیتوں اور قوت بیان کے سیلاب بلاں خیز سے خوفزدہ تھے۔ فحاشی کا فتوی دینے والے وہ تھے جن کے بستر کی زینت بننے سے سارہ نے انکار کر دیا تھا۔ یہ لکھنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ سارہ نے اس راستے پر قدم ہی نہیں رکھے تھے۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا تیسری شادی اس کی زندگی کے المیوں کی ایک نئی کڑی تھی' جو اسے پاگل خانے تک لے گئی۔ لہٰذا چوتھی شادی اور اس کے انجام پر تبصرہ کرنا بے کار ہے۔ اس نے کہا ہے

؎ میں ثابت قدم ہی ٹوٹی تھی میرا خیال ہے کہ ثابت قدم نہیں تھی۔ اس لئے کہ ثابت قدم ہونے کے لئے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جب کہ سارہ نے ہر بار' اور ہر حال میں کسی نہ کسی مرد کا سہارہ قبول کیا۔ یوں ٹوٹنے کا عمل ہوتا رہا۔ اگرچہ وہ کہتی ہے کہ

؎ انسان دوسری غلطی کبھی نہیں کرتا مگر اس نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ خدا کو تیسری بار دھراتی ہے۔ یہی تو میرا بھی بنیادی نقطہ ہے کہ ہمیں کسی 'ایک بات کو ماننا چاہیئے' خدا ہے یا نہیں ہے۔ جب خدا ہے تو وہ وحدہ لاشریک ہے۔ اسے بار بار دھرانے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر نہیں ہے تو جو کچھ ہو دھراتے ہیں وہ کم از کم خدا نہیں ہوتا۔ پھر ایسے میں تو کھلونے کا مقدر زیادہ سے زیادہ ٹوٹنا رہ جاتا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی خواہشوں میں رومانی ہوں لیکن زندگی میں عملی ہوں۔ مجھے کلائیوں میں چوڑیاں اور بالوں میں گجرے سجانا پسند ہیں۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ خواہش اپنی ہوتی ہے اس کی تکمیل کرنے والے ہاتھ کسی محبوب ہستی کے ہوتے ہیں۔ جو دل کے رخسار پر ہمیشہ پیار کی تھپکی دیتے ہیں اور جھلسی دوپہروں میں سائباں بن جاتے ہیں پھر کسی خاموش گوشے میں یہ کلیاں پھولوں میں ڈھلتی ہیں اور توے پر روٹی پلٹتے ہوئے کلائی کی ساری چوڑیاں بج

اٹھتی ہیں شاید اسے ترقی پسند افراد فرسودہ خیال کہیں لیکن میں اخلاقی پابندیوں کو تسلیم کرتی ہوں یہی انسان اور جانور کے درمیان بنیادی فرق ہے (بلکہ ماہر حیوانیات نے تو ثابت کیا ہے کہ کچھ اخلاقی ضوابط تو جانوروں میں بھی پائے جاتے ہیں) بہر حال یہاں ذکر تھا سارہ کا مسئلہ یہ تھا کہ اس نے ہاتھوں میں چوڑیاں بھی خود سجائیں اور گجرے بھی خود پہنے پھر اس کے ساتھ انگلیوں میں سگریٹ دبا کر مردوں کے درمیان بیٹھ کر ادب کے صرف ان حصوں کی بات کی جن میں جنس کا ذکر زیادہ تھا۔ اس لئے اس کے ارد گرد جمع ہونے والے مردوں نے بھی اسے جنسی حوالے سے زیادہ دیکھا۔ اس کے دوست اسکی بربادیوں اور دکھوں کا ذمہ دار ان مردوں اور عورتوں کو ٹھہراتے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے اپنے عورت ہونے کا شدت سے احساس تھا۔ بلکہ اکثر وہ صرف عورت ہونے کو ہی ترجیح دیتی تھی۔ اس لئے مجھے سارا کے سارے طریقہ کار سے اختلاف ہے۔ اس نے اپنے اس عمل سے ان ساری عورتوں کے راستے میں بھی کانٹے بو دیے ہیں جو اپنی جائز جدوجہد کے لئے گھروں سے نکلتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میں اس کی تباہی اور پھر موت کی زیادہ ذمہ داری اس کے ہمدردوں اور خیر خواہوں کے ذمے لگاتی ہوں۔

امرتا پریتم ——————— جنہوں نے اسے یہ باور کرایا کی وہ نثری نظم میں جس مقام پر ہے وہاں آج تک کوئی خاتون شاعرہ نہیں پہنچ سکی۔ لیکن جب وہ ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے کے ہاتھوں جا جا کر برباد ہوتی رہی تھی، اس وقت امرتا جی کیا کر رہی تھیں؟ کیا اتنی محبت اور بلندی دینے والی امرتا جی اس اپنے پاس رکھ کر عزت اور آبرو کے ساتھ لکھنے اور جینے کا موقع نہیں دے سکتی تھیں؟ یہ بات بجائے خود مہمل ہے کہ ”وہ ضمیر سے زیادہ جاگ چکی تھی۔“ منطقی طور پر وہ ضمیر سے زیادہ سو چکی تھی اسے انسانی صحیفے کی پہلی آیت قرار دینے سے پہلے اس کی تاریخ دیکھ لینی چاہیئے۔ انسانی صحیفہ اگر آسمانی صحیفہ سے بلند تر نہیں ہو گا تو وہ صحیفہ نہیں کہلائے گا، اور بلندی کے تصور کو سارا کے تصور کے ساتھ یکجا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے وہ اس صحیفہ کی پہلی آیت کیسے بن سکتی ہے؟ ہاں یہ مجھے تسلیم ہے کہ جو انسانی صحیفہ لکھا جا رہا ہے وہ اس کی کوئی نہ کوئی آیت ضرور ہے۔

احمد سلیم ——————— لگتا ہے کہ سارا کی داستان لکھتے اور بیان کرتے ہوئے یہی ایک واحد انسان ہے جو اس ملنے والے تمام شیطانوں میں بہتر تھا۔ بالفاظ دیگر سارہ کا یہ دوست کوئی دیوتا تھا، جو ساری گندگیوں اور انسانی کمزوریوں سے مبرا تھا۔ اسے سارا سے ہمدردی بھی تھی۔ لیکن جو مزے لے لے کر سارہ کی داستان سنتا تھا۔ بیان کرتا تھا اور لکھتا تھا۔ کبھی کبھار اس سے مل کر پاکیزہ زندگی گزارنے کی تلقین کرتا تھا،

اور اپنے راستے پر چل پڑتا تھامہان دیوتا جو تھاسارہ کے مرنے کے بعد اس نے سکھ کا سانس لیا کہ اس کے سر کوئی ذمہ داری نہیں آئی اب وہ اپنا قلمی' صحافتی اور ادبی فرض نبھا رہا ہے۔ سارہ پر جذباتی کالم اور آرٹیکل لکھ رہا ہے۔ کتاب چھاپ رہا ہے۔ ان ساری تحریروں کی آمدنی بھی وہ ضرور حاصل کرے گا' کیونکہ آخر پیٹ اس کے ساتھ بھی ہے۔ اس سے قبل ثروت سلطانہ' مبارک احمد' راشد نور اور افتخار جالب یہ کام کر چکے ہیں۔

سعید احمد ـــــــــــــــ اسے سارہ سے والہانہ عشق تھا اور سارہ کو اس سے! سارہ لکھتی ہے "سعید زندگی کے بیکراں عذابوں کے بعد تم سے ملاقات اور میرا اور تمہارا بیکراں پیار' زندگی کے کروڑوں دنوں پر اپنے دن کافی ہیں۔ تم مجھے کسی کھونٹی سے بھی باندھ دیتے تو میرے لئے سعادت ہوتی۔ میں تمہارے اندر کتنی موجود ہوں اور رہوں گی۔ زندگی کی تلاش کو آج ختم کرتی ہوں کہ میں نے جان لیا کہ زندگی تمہارے علاوہ کچھ بھی نہیں' کچھ بھی تو نہیں اور انسان کو زندگی میں کیا چاہیئے؟"

میرا سوال ہے کہ سعید نے سارہ کو وہ کھونٹی ہی کیوں نہ دیدی جو اس کے لئے سعادت تھی؟ جواب آیا "دراصل.....وہ.... ایسا ہے کہ سعید کی اپنی سیٹل زندگی تھی' بیوی بچے تھے' وہ اس میں کسی قسم کی ہلچل پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"اور وہ سارہ سے بے کراں محبت؟"

"ہاں....وہ....وہ تھی' بہت تھی' بلکہ اب بھی وہ اسے بہت چاہتا ہے"۔

خوب دیکھا۔ آپ نے! امرتا نے لکھا ہے ہر دوست مرزا ہوتا ہے۔ سارہ کے یہ دوست مرزا نہیں تھے۔ بلکہ دوست ہی نہیں تھے۔ اسی لئے میں سارہ کی بربادی اور موت کا اصل ذمہ دار اس کے "ان" دوستوں کو ٹھہراتی ہوں۔ وہ خود بھی تو کہتی تھی۔ ؎

چائے کے ساتھ غیبت کے کیک
ضروری ہوتے ہیں۔

اور چلغوزی کی کتاب کا دیباچہ
ہر شخص لکھتا ہے۔

دیوندر ستیارتی ـــــــــــــــ جنہوں نے کہا تھا کہ میری بیٹی کویتا مر گئی ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ سارہ شگفتہ کے روپ میں شعر لکھ رہی ہے۔ سارا کہتی ہے ــــــ

ــــــ کسی نے بیٹی کہا کسی نے جسم سنوارا۔

میں ان سارے لوگوں کی نیتوں پر شک نہیں کر رہی۔ میں تو بس یہ سوچتی ہوں کہ جب وہ پاگل خانے کی چار دیواری میں ہوتی تھی تو اس کی مرزا جیسی امرتا کیا تھیں۔ مہان دیوتا احمد سلیم کیا کر رہے تھے۔ بیٹی

کہنے والے دیوندر ستیارتی کا دل کیوں نہیں تڑپ اٹھتا تھا؟ سعید کا قیامت خیز عشق کدھر سو جاتا تھا؟ جب وہ ایک کے بعد دوسرے مرد کی بانہوں میں گری ہوتی تھی. شراب سگریٹ اور دوسرے نشے اسے گھیرے ہوتے تھے' ان میں سے کسی ایک کو خیال نہیں آیا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھ لیں ـــــــــ! کیسے رکھتے؟ اتنی نظریں' اتنی باتیں' اتنے افسانے برداشت کرنے والا مضبوط سینہ کس کے پاس تھا؟

پھر عبداللہ علیم کو گالیاں دینے کا فائدہ؟

پروین شاکر کو برا بھلا کہنے کا حاصل؟

جائے نماز سے بھی چھوٹے روحانی قد کے حامل بزرگوں پر تھو کنا چہ معنی دارد؟

۔ رہ گیا نثری نظم میں سارہ شگفتہ کا مقام؟ تو میں نقاد ہوں نہ شاعرہ' لہٰذا میں اسکی شاعری پر کوئی سیر حاصل تبصرہ کرنے کی اہل نہیں ہوں۔ البتہ اتنا ضرور محسوس کرتی ہوں کہ وہ بغیر پروگرام اور پلان کے لکھتی تھی۔ کیا لکھتی تھی؟ اسکا اسے خود بھی پتہ نہیں چلتا تھا۔ اس لئے اکثر لکھتے لکھتے اسکی شاعری صاف صاف نثر بن جاتی تھی ۔ لیکن یہ لکھنا کہ

ـ انسان سے ضبط تو ہاں مانگتی ہے دانکار کہاں۔ ثابت کرتا ہے کہ ہاں جتنی ضبط سے انکار کرنے والی کے اندر کتنی بغاوت ہوگی. یہ بغاوت اس نے کتابوں اور فلسفیوں سے نہیں سیکھی دزندگی کے جبر نے اسکے اندر پیدا کی ۔ اس لئے اس کے اندر ابلیس کی طرح بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے انکار کی جرات موت کے لمحے تک رہی ۔

ایک جگہ اس کی سطر ہے۔ کاش عورت بھی جنازے کو کاندھا دے سکتی۔ میں حیران ہوں جنازے کو کاندھا دینے کی "کاش" رکھنے والی کو یاد تو ہوگا کہ اس سماج میں وہاں کی ضبط رکھنے والی دبے شمار عورتیں ہیں جو تمام عمر اپنے جنازے کو خود ہی کندھا دیتی ہیں۔ ایسے میں مزید جنازوں کا بوجھ اس عورت کے کندھے پر ویسے بھی جائز نہیں ہے اور پھر یہ کہ ـــــ عورت تو انسان کو جنم دینے کے بعد بھی کھری نہیں۔

یہ پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کسی قید خانے میں بند تھی۔ جہاں اس نے اپنے مشاہدے کی ایک کھڑکی کھلی رکھی ہوئی تھی۔ اور جو کچھ وہ دیکھ اور محسوس کر رہی تھی دبغیر تکنیکی ضرورتوں کو پورا کئے کاغذ پر لکھ رہی تھی۔ اس لئے بہت زیادہ پڑھی لکھی نہ ہونے کے باوجود اس کی شاعری حیرت انگیز طور پر بہت

سے پڑھے لکھوں سے بہتر ہے۔ اس کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی اس کی ORIGINALITY ہے جو ہمارے ہاں خصوصاً خواتین میں کم کم پائی جاتی ہے۔ ایسی خواتین جو امریکا یونگ جیسی مشہور عالم شاعرہ کی تخلیق کا چربہ اپنے نام سے چھاپ کر اعلیٰ عہدوں کی اہل قرار پائی گئی ہیں۔ اگر اردو ادب میں ORIGINALITY کی تحقیق کی جائے تو کم از کم سارہ شگفتہ کو اوریجنل شاعرہ تو قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جہاں وہ اپنی شاعری کی ابتداء پر تھی اس کے خیر خواہوں نے واہ واہ اور مداح سرائی کے ذریعے اس کی ابتداء کو انتہاء بنا کر اس کے فن کو بھی مار ڈالا۔ اس طرح وہ تعصب پسند جو اسے عورت سمجھ تک صرف تفریح چاہتے تھے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں اور اچھوتے موضوعات سے خوفزدہ تھے کہ ایک روز اس نے ان سب کو پیچھے چھوڑ کر کم از کم نثری نظم کے صحیفے کی پہلی آیت تو ضرور بننا تھا انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔

ایک اور ظلم بلکہ حقیقی ظلم جو اس کے ارد گرد پھیلے دوستوں نے کیا وہ یہ تھا کہ ان میں سے کسی نے بھی اس کے اصل دکھ کو نہ جانا۔ یہ اس کے بچپن کی غربت کا حال لکھ لکھ کر طبقاتی نظام کو گالیاں دیتے ہیں۔ اس سے قرض لینے والوں پر تھوکتے ہیں اس کے شوہروں کے مظالم کا ذکر بین کے انداز میں کرتے ہیں اور تقریباً ہر دوست اس کے مردہ بچے کی قبر مہیا کرنے کو تیار ہے لیکن کسی نے بھی اس کی شاعری کو اس زاویئے سے نہیں دیکھا جس کی تہہ میں اس کی بے چینیوں اور پاگل پن کے دوروں کے سارے بھید موجود تھے۔

؎ آگ کی تلاش میں میرے کئی چراغ بجھ گئے۔

خدا جانے آگ سے اس کی کیا مراد تھی؟ اگر آگ سے اس کی مراد تبدیلی ہی تھی، تو یہ درد واضح ہے کہ پہلے شوہر گلگھر چھوڑ کر وہ جس تبدیلی کی خواہاں تھی وہ تو اس کو ملی سو نہ ملی مگر اس کے دل کی چراغ اس کے تینوں بچے ضرور اس سے بچھڑ گئے یہ اس کے دل کا ایسا زخم تھا جو مجھے یقین ہے آج اس کی قبر تک میں رس رہا ہوگا۔ جب ہی تو وہ کہتی تھی۔

؎ میرے گجرے کے تین پھول پیاسے ہیں

اپنی ذاتی زندگی کو بیان کرتے ہوئے اسکا انداز جتنا غیر حقیقی اور غیر فطری ہے، وہ اس کے زندگی کے المیوں کو ڈھونگ اور دکھاوا بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اس پر اس کے مذکورہ دوستوں کی شہہ، جس نے لوگوں کو اس داستان بازی پر ہنسنے کا موقع دیا۔ وہ اس دنیا کی پہلی انسان نہیں تھی، جس نے فاقہ کیا، جسم دیا اور دھوکہ کھائے۔ ایسا کرنے میں اس کے اپنے قصور بھی شامل تھے پھر ان داستانوں کی تشہیر کا جو انداز اس نے اور اس کے دوستوں نے اپنایا، مجھے اس پر بھی اعتراض ہے۔ اسی لئے تو میں نے کہا کہ میں سارہ شگفتہ سے اختلاف کرتی ہوں۔ لہذا

میں اس سے انصاف نہ کر سکوں گی۔ پھر میری تو حیثیت ہی کیا اس کے ساتھ تو انصاف اس کے دوستوں نے بھی نہیں کیا۔ وہ کہتی تھی

؎ میں نے اپنے آنگن میں تین روحیں گاڑھی تھیں۔

امر تاجی کا کہنا ہے کہ "یہ زمین وہ زمین نہیں تھی جہاں وہ اپنا گھر تعمیر کر لیتی اور اسی لئے اس نے گھر کی جگہ ایک قبر تعمیر کر لی"۔ افسوس کہ امر تاجی سمیت اس کے سارے خیر خواہوں کو پتہ نہ چل سکا کہ اس زمین پر اس نے اپنا گھر تعمیر کیا تھا لیکن اسے اپنے بچوں کی قبر بنا دیا۔ اس آنگن میں وہ تین روحیں دفن کر آئی تھی۔ یہ سب لوگ تو اس کے مرنے والے بچے کی قبر پر آنسو بہاتے تھے جو بقول اس کے میرے دل میں ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کو پتہ نہیں چل سکا کہ اس کی شاعری میں بین السطور اس "پہلی بات" کا ذکر پورے دکھ اور نقصان کی صورت میں موجود ہے جو "آخری بات" ہوتی ہے۔

تو سارہ شگفتہ کا ماتم کرنے والے اس کے دوستو! میری نگاہ میں تم ہی لوگ اس کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ اس کے فن کے قاتل اور اسکی موت کے ذمہ دار!

اور یہی تھا سارہ شگفتہ کا تمام کا تمام المیہ!

گوہر سلطانہ عظمی

۲۴ دسمبر ۱۹۸۹ء

۴ جون کی رات اندازاً دس اور گیارہ بجے کے درمیان ڈرگ روڈ کالونی سے گزرتی لوکل ٹرین، پنجابی اور اُردو کی ممتاز شاعرہ سارا شگفتہ کے ٹکڑے اُڑاتی گزر گئی۔ ٹرین کے ڈرائیور نے اتنا دیکھا کہ ایک لڑکی زور زور سے بازو ہلاتی ہوئی گاڑی کو روکنے کا اشارہ کر رہی ہے اور پھر آناً فاناً اس کی چیخیں انجن کے شور میں مدغم ہو گئیں۔ اُس کی لاش کے پاس سے قرۃ العین حیدر کی کتاب "شیشے کے گھر" اور اگربتیوں کا ایک پیکٹ ملا۔ کتاب پر وضاحت سے اس کے گھر کا پتا لکھا ہوا تھا اور اگربتیاں لے کر وہ اپنی ماں کی قبر پر جا رہی تھی۔ کتاب میں وضاحت سے لکھا ہوا پتا خودکشی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اگربتیوں سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ اپنی ماں کی قبر پر جا رہی تھی۔ اپنی قبر پر نہیں۔

کہتے ہیں لاش دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور پوسٹ مارٹم کے قابل نہیں تھی لیکن ریلوے پولیس کی طرف سے جناح اسپتال کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کہتی ہے کہ اس پر دل کا دورہ پڑا اور گاڑی کے گزرنے سے پہلے ہی وہ انتقال کر چکی تھی۔ پھر یہ بکھرا ہوا خون ...؟ شاید ریلوے والے وہ رقم بچانا چاہتے ہوں گے جو حادثے کی صورت میں انھیں مرنے والے کے ورثا کو دینا پڑتی۔ ویسے بھی اگر ایک لاش کو پھانسی دی جا سکتی ہے تو کیا ایک لاش پر سے گاڑی نہیں گزر سکتی؟

سارا شگفتہ کی ناگہاں اور جواں سال موت نے ہمارے ادب کے خاموش پانیوں میں ایک کنکر سا اچھال دیا ہے۔ ۳۱ اکتوبر ۸۹ء کو وہ پینتیس ۳۵ برس کی ہو گئی ہے۔ پنجابی اور اردو کی اس معروف شاعرہ کو پاک و ہند میں

سرحدوں کے دونوں طرف شہرت سے زیادہ بدنامیاں ہیں۔ اس کے شاعرانہ MERIT کے بارے میں دونوں طرف متضاد آراء ہیں۔ امرتا پریتم کے ہندوستانی پنجاب میں اس کا نام صرف تین چار سال پہلے پہنچا اور سنہ ۱۹۸۲ء میں جب اسکا مجموعہ کلام "بلدے اکھر" چھپا تو وہاں کی مقبول ترین شاعرہ تھی۔ پنجابی کے علاوہ وہاں اس کا کلام اُردو اور ہندی میں بھی چھپا۔ کلکتہ میں اسکے بنگالی ترجموں پر کام ہو رہا ہے۔ امرتا پریتم ہی نے گزشتہ برس کے کلام کے بلغاروی ترجمے کی سفارش کی تھی اور اگلے سال سارا کو وہاں بلایا جانا تھا۔

پاکستان میں سارا نے پنجابی سے زیادہ اُردو میں شہرت حاصل کی۔ اس کا شمار نثری نظم کے صفِ اوّل کے شعراء میں کیا گیا ہے۔ اس کے کلام کو سنجیدگی سے لینے والوں کے علاوہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ جو اس کی شاعری کو "ہذیان" سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور ان کا کہنا ہے کہ یہ محض جذبات کا ایک اُبال تھا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی نظموں میں اگر مناسب کاٹ چھانٹ یا ایڈیٹنگ کی جائے تو وہ پڑھنے کے قابل ہو سکتی ہیں۔ جذباتی انتہا پسند، بے باک بلکہ کسی حد تک مُنہ پھٹ ہونے کے باعث، بہت سے حلقوں میں سارا کو ناپسند کیا جاتا تھا خصوصاً یہاں کی گُڈّی گُڈّی سے شاعرات اُس سے ڈرتی اور نفرت کرتی تھیں۔ نثری نظم میں اسکی فتوحات نے اس کے بہت سے دشمن پیدا کر دیئے۔ مرد شاعروں اور نقادوں نے اُسے بہت "آسان" سمجھا اور اس پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے زیر کرنا آسان نہ تھا۔ اس کے نتیجے میں جھنجلا کر کچھ لوگوں نے اُس پر آوارگی کے الزامات لگائے۔ اس نے ادبی دنیا کی منافقتوں کے بخیے اُدھیڑ دیئے۔ اُس نے اپنے آنسو چھپا لیے اور اپنے لہو میں قلم ڈبو کر سچے حرف لکھے۔ اس نے پاکستان میں رہ کر شعر کہنے اور جینے کی اس سے کہیں زیادہ قیمت چکائی جو قیمت

ہندوستان میں امرتا پریتم اور کملا داس کو اور امریکہ میں سلویا پلاتھ کو چکانا پڑی تھی۔

سارا کو انسانی شکل میں اپنے اوپر جھپٹتے کتّوں سے لے کر، دماغی امراض کے اسپتالوں میں بجلی کے منحوس جھٹکوں اور ریل گاڑی کے نیچے آکر جان دینے تک جو کچھ سہنا پڑا ہے، اسکی ایک تند و تلخ تاریخ ہے جسے ہمارے عہد کا بزدل اور کائر ادیب قلم بند کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ سارا کے جسم اور اس کی روح کے برہنہ زخموں کو لکھنے کیلئے آدمی کے ہاتھوں اور قلم میں شرم و حیا ہونا چاہیئے اور ہمارے ادیبوں کی اکثریت کے قلم اور ہاتھ اس جوہر سے محروم ہیں؛ سارا کے رحم سے ٹوٹے کھلونوں کی چیخیں سُنائی دیتی ہیں۔ اس کے لہو میں علم قہقہے لگاتا سُنائی دیتا ہے۔ سارا کے اس بچّے کو کس نے دیکھا ہے جس نے جنم لینے کے بعد ایک پل کیلئے آنکھیں کھولیں اور پھر "کفن" کمانے چلا گیا؟ اسی لیے اس کے .... مجموعے کا نام "آنکھیں" ہے۔ پیاس کے کانٹے پلیس کر جس سارا کی آنکھیں بنائی گئی تھیں، میں نے اُس سارا سے کہا تھا۔

" دنیا ہر فرد کے بعد تیسری ہوتی ہے اور دوسرا فرد غائب ہو جاتا ہے اسی لیے ہم تیسری دُنیا کے شاعر ہیں!"

بدنامی ایک تمغے کی طرح بھی ہو سکتی ہے اور ایک تیز کٹیلے خنجر کی طرح بھی لیکن کبھی کبھی بہ یک وقت دونوں طرح کی بھی ہو سکتی ہے۔ سارا شگفتہ کے معاملے میں یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے۔ میں نے پہلی بار جب اس کے بارے میں سُنا، میرے لیے وہ سب کچھ ہضم کرنا مشکل تھا۔ ایک لڑکی اس حد تک کیسے جا سکتی ہے؟ انھی دنوں اسکی نظمیں سامنے آئیں۔ پڑھکر محسوس ہوا کہ سارا کی بدنامی اُس کے وجود کے لیے ایک تیز کٹیلے خنجر کی طرح ہے لیکن کہنے والے کہتے تھے کہ اپنے بارے میں اِن اُلٹی سیدھی باتوں کو وہ تمغے کی طرح سمجھتی ہے، ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ اس کے مشکل حالات چل

رہے تھے اور کچھ دوست دونوں کے درمیان ان حالات کو آسان بنانے میں
کوشاں تھے۔ پھر ایک دن پتا چلا کہ ان مشکل حالات نے ان دونوں کے درمیان
علیحدگی اور بالآخر طلاق کی صورت اختیار کرلی ہے۔

میں جب پہلی بار اس سے ملا، یہ سب باتیں گزر چکی تھیں، اس نے
اپنی پنجابی نظمیں سنائیں۔ میں ان دنوں اپنے کسی ذاتی معاملے میں کافی پریشان
تھا اور شاید ٹھیک سے اُسے سن نہیں رہا تھا۔ اس نے بھانپ لیا اور کہا:۔

"کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"کوئی پیسوں کی مشکل تو نہیں؟"

یہ سن کر میں نے بڑی عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ہم پہلی
بار ملے تھے۔ میں اس سے ایسی بے تکلفی کی توقع نہیں کرسکتا تھا۔

"میں سن رہا ہوں۔ آپ نظمیں سنائیں۔" میں نے جیسے ایک ضد کے
ساتھ کہا۔ اس نے اپنے کاغذ سمیٹ لیے۔ ڈائری بند کر دی اور بولی:۔

"شاعری انسان کی زندگی، انسان کی مجبوری سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتی۔
مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آپ کی نوکری ختم کر دی گئی ہے۔ لاہور میں آپ کی ماں
بیمار ہیں اور آپ نظمیں لکھنے کی جگہ کمرشل رائٹنگ کر رہے ہیں۔ میں نے سوچا شاید
میں کسی کام آسکوں۔"

میں سچ مچ پریشان تھا، لیکن میں نے اُس کی مدد نہ لی ــــــ پھر کئی
مہینوں تک اس سے ملاقات نہ ہوسکی۔ دوبارہ ملاقات ہوئی تو ان دنوں وہ
ہندوستان سے واپس آئی تھی اور ہر طرف اسکی دھوم مچی ہوئی تھی۔

ہندوستان میں وہ کافی ہنگامے کر کے آئی تھی۔ اس ملاقات سے چند
روز پہلے مجھے امرتا پریتم کے رسالے سے ایک عجیب اطلاع ملی تھی۔ بلفظ

بہ لفظ نقل کرتا ہوں۔

پاکستان سے ایک جوان شاعرہ ہندوستان
آکر چند روز کے لیے ایک اردو ادیب کے
گھر ٹھہری۔ ایک رات، اس ادیب کے
بیوی بچّے سو گئے تو وہ شاعرہ کے کمرے میں
جاکر منٹو کے افسانوں پر بحث کرنے لگا۔
اس بحث کے دوران ادیب نے پوچھا:
"تم نے منٹو کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھا ہے؟"
شاعرہ نے کہا: "ہاں۔ پڑھا ہے۔"
ادیب نے پھر پوچھا: "تم نے اس کا افسانہ "کالی شلوار" بھی
پڑھا ہے؟"
جب شاعرہ نے کہا کہ ہاں وہ افسانہ بھی اس کا پڑھا ہوا ہے تو ادیب بولا:
"آئی لو یو۔"
"اس پر وہ شاعرہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر کہنے لگی:
"جی، منٹو کا یہ افسانہ میری نظر سے نہیں گزرا۔"
"سو میں نے سارا سے کہا "سارا! کیا امرتا نے ٹھیک لکھا ہے؟"
اس نے تصدیق کی پھر وہ بہت دیر تک اس طویل انٹرویو کی
باتیں کرتی رہی جو امرتا نے اپنے رسالے "ناگ منی" کے لیے لیا تھا اور جو سارا
کے پاکستان واپس آنے کے بعد شائع ہوا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک اس
نے پوچھا۔
"تمھارے پاس کچھ پیسے ہوں گے؟"
"کتنے؟"
"یہی، پچاس، سو۔"

"ہاں، ہو سکتے ہیں۔"

"ہو سکتے ہیں یا ہیں؟"

بعد میں کھلا کہ یہ سوال جواب میرے مالی حالات معلوم کرنے کے لیے تھے۔ پھر مزید کھلا کہ شہر میں اپنے اکثر ملنے والوں سے وہ اسی طرح کے سوال جواب کرتی ہے اور اس حوالے سے ایکسپلائٹ ہوتی رہتی ہے۔ کسی نے مکان کا ایڈوانس دینا ہے۔ کسی کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ کسی کو اپنی کتاب چھاپنا ہے۔ کسی کے پاس ڈاکٹر تک جانے کے لیے بھی پیسے نہیں۔

میں نے پوچھا "ان عنایات کا پس منظر؟"

"کچھ دیر کے لیے وہ چپ رہی۔ پھر بہت مدہم سُروں میں بولی:۔

"ہمارے گھر پانی اور میرے بچپن کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ راکھ میری بھوک کی طرف بڑھتی تو اس روشنی سے میرے بہن بھائی مجھے نظر آجاتے۔ میرا قاعدہ پھٹ جاتا تو میں پورے لفظ پڑھ لیتی اور کھیتوں میں بھوکی چلتی ہوئی اسکول درس لینے جاتی۔ میں اور میری بڑی بہن ایک ہی کلاس میں تھیں۔ ہم ٹاٹ پر بیٹھے بلیک بورڈ کو سفید ہوتا دیکھتے، جیسے جھوٹ ہو۔ ایسے ہی ایک روز ہماری مس نے اعلان کیا:

"جو یونیفارم نہ خرید سکتا ہو، ہاتھ بلند کرے۔"

سب سے پہلے میرا ہاتھ بلند ہوا کیونکہ تمام لڑکیوں میں صرف میں ہی جھوٹ نہیں تھی۔ میری بہن نے میرا ہاتھ فوراً نیچے کر دیا۔ اور میری درس دینے والی نے کہا:

"بھوکی!"

شاید وہ بھی کھیت سے گزر کر آئی تھی۔ پھر ایک روز مس نے پوچھا "ابتلاء کا مطلب؟

میں غصّے میں بولی تھی "بھوکی!"
میں بمشکل کہہ سکا: "اوہ"
اس نے بات جاری رکھی:

" دو دن سے ہمارے برتنوں میں پانی تھا اور ہمارے پاس پیاس دوسری تھی۔ دوپہر کے وقت میرا بھائی، عمر بارہ سال، گوبھی لے آیا اور چپکے سے میرے کان میں کہا: جیل کے باہر جو کھیت ہے، جسے قیدیوں نے سینچا ہے وہاں سے چوری کر کے لایا ہوں۔" یاد ہے میں نے حق حلال کا مال سمجھ کر چٹخارے لیے تھے۔"

فضا میں دُھواں بھر گیا، بھوک کا دھواں، غربت کا دھواں۔ دوسرے کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے کا دھواں، مرمر کر جینے کا دھواں، سگریٹ کا دھواں۔ میں نے دیکھا آدھے گھنٹے میں سارا اپنا پانچواں سگریٹ بجھا رہی تھی۔

زمین پر سگریٹ کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بات جاری رکھی:۔

"میں نے یہ کھیل ایک روز پڑوس میں دیکھا۔ شنّو نے اپنے زیورات اتارے اور انگیٹھی پر رکھ دیئے۔ میں چور نیت سے انھیں دیکھتی رہی۔ اگر ہار چُرایا تو باپ کے پاس کراچی چلی جاؤں گی، اگر انگوٹھی چُرائی تو امّی کے کپڑے خرید لوں گی۔ اگر جھمکے چُرا لئے تو کم از کم بھوک کو ننگا نچوا دوں گی۔

گڈّی آئی گڈّی آئی نارووال دی

بابے دی داڑھی وچ اگ بالدی

اور پھر ایک دن شٹاپو کھیلتے کھیلتے کوٹلہ بھی ختم ہو گیا۔

پھر یہ دوسرا محلّہ تھا' اور اس کی عمر ۷ سال۔
محلّے داروں نے ساری زکوٰۃ اکٹھی کی ۔ اور اس کی ماں کے ہاتھ پر لا رکھی :
"بی بی ! سوکن کے سر پر رہ ۔ کراچی چلی جا۔"
ریل کی پٹڑی فاقہ قبول کرتی جا رہی تھی اور انسان سفر میں تھا۔

اور انسان سفر میں ہے۔
اُسے وہ بات بھی نہیں بھولتی جب وہ بھنگیوں کے گھر جا کر کھانا کھایا کرتی۔ ماں کہتی: "روٹی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" کیا بتاتی، روٹی کہاں تک پک چکی ہے۔ مغرب تو ہمارے بھنگیوں کے گھر میں ہے۔ ہر فرد کماتا ہے۔ بھنگیوں کو اچھوت کہنے والا، انسانوں کا اچھوت ہے۔ خدا ہر انسان کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے، اب یہ خدا کی مرضی ہے کہ وہ آیت اتارے یا کُفر!

وہ قبرستان گئی فاتحہ پڑھتی اور ہر قبر کو اپنے گناہ سناتی رہی۔ اُسے ان کی زندگیوں پر بڑی مسرت ہوئی کہ وہ اس کے گناہ سُن کر بھی خاموش رہے۔
اس نے قبرستان کے مالی کو دس روپے دیئے۔
مالی نے پوچھا "کون سی قبر ہے آپ کی ؟"
سارا نے کہا "بابا ! یہ ساری قبریں میری ہیں۔"
اُس نے ایک قبرستان کی دہلیز چھوڑی۔ رکشے میں بیٹھی اور خواہ مخواہ اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ پھر دوسرے قبرستان چلی گئی۔ یہاں اس نے نکڑ پر کھڑے ہو کر دُعا مانگی۔ رکشے والا دیکھتا رہا۔
"بی بی ! تمھیں کہاں جانا ہے ؟"
اور وہ سرگوشی بھی نہ کر سکی۔ دو روپے اُس کے پاس بچے تھے۔ بس

پر سوار ہوئی اور ایک مصنوعی نقاد کے گھر پہنچی۔ وہ اس قدر نقاد نکلا کہ اس کا باقی ڈیڑھ روپیہ بھی خرچ ہو گیا لیکن وہ اپنی پائیاں وصول کر چکی تھی۔

پھر ایک اور سگریٹ، اور اس نے کہا:

"یہاں عورت وہ ہے جو پردہ کرتی ہے۔ ہنس نہیں سکتی، وقتِ مقرّرہ پر چلتی ہے۔ گاتی ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میری تحریریں پڑھ کر مرد پردہ کرنے لگتے ہیں۔ میں بھڑووں اور طوائفوں کو سلام کرتی ہوں کہ بھوک میں نے بھی جھیلی ہے۔"

"تم بہت جذباتی ہو۔" میں نے اس کی گفتگو سے ڈر کر جلدی سے کہا۔

"لیکن وہ بولتی رہی!"

"ایک بار نوان حرام زادوں نے حد کر دی، مجھے پھر بیاہ کر لے گئے۔ مجھ پر شعر لکھنے کی پابندی تھی، میں ٹائلٹ میں جا کر شعر لکھا کرتی۔ میں اندھیرے کی سیاہی سے تحریر ہوتی رہی۔"

جائیداد کے بٹوارے میں اس کے ہاتھ کچھ رقم لگی، تو سکّوں کی فصل چل نکلی۔ وہ تنہا رہنے لگی۔ ایک مصنوعی شاعر اس کے پاس آیا اور بولا:

"مجھے دس ہزار روپے چاہئیں۔"

اس کے پاس نہیں تھے لیکن پھر اچانک اسے خیال آیا کہ مکان کا ایڈوانس تو ہے۔ اس نے مالکِ مکان سے کہا:

"میں لاہور جا رہی ہوں۔ مجھے ایڈوانس واپس کر دو۔"

پیسے شاعر کو دیئے اور سامان اپنی ایک دوست کے ہاں رکھ دیا۔

پھر کچھ عرصے بعد، اُسی شاعر کے گھر اتنی رات گئے "قبلہ خانہ بدوش ہوں، دس روپوں کی ضرورت تھی، آ گئی۔"

وہ شاعر نہ جان سکا کہ سارا خانہ بدوش کیوں تھی؟ ایک بار پھر اُسے

سوجھی۔ بھیک مانگ کر دیکھے ـــــ اُسے بھیک مانگنے کے بعد معلوم ہوا کہ فقیرنی کس طرح مانگتی ہے اور لوگ کیسی خیرات رکھتے ہیں۔

اب وہ شاعری کی محفل میں تھی اور شعر سُنا رہی تھی۔ ہر شخص اس کے جسم کی داد دے رہا تھا۔ ویسے بھی عورت ہونے کے ناتے ۳۳ نمبر ہوتے ہی ہیں اور اگر ایک آدھ مصرعہ سمجھ میں آگیا تو سمجھو، اے گریڈ۔

اس نے انسان کو پانے کے لیے آنکھیں فروخت کیں۔ ہاتھ فروخت کیے اور اس خرید و فروخت میں یہ بھی بھول گئی کہ بعض چیزوں کی قیمت کا تعیّن بیچنے والا نہیں، خریدنے والا بھی نہیں، صرف خدا کرتا ہے اور پھر اُسے بھول جاتا ہے۔

کمرے کی کھڑکیاں بھی کُھلی تھیں، دونوں دروازے بھی۔ لیکن دھواں پھر بھی بہت تھا۔ خدا کے نام کا دیا روشن ہوا تو میں نے ایک اور دیا جلانا چاہا۔

امرتا پریتم ؟

" میرا جی چاہتا ہے، امرتا سے کہوں، امرتا پریتم ! یہاں کوئی اسرور نہیں ہے۔ میری چادر کے داغ، تم ضرور سُن لوگی۔ تمھی نے تو میکے پڑاؤ کا اہتمام کیا ہے۔ اور میں نے آگ میں پڑاؤ ڈال رکھا ہے، جی چاہتا ہے تمھاری جوتیاں چُرا لوں ـــــ تمھیں اپنے بوسوں سے بیاہ دوں اور جنم جنم کے پیاسے لباس تم سے چھین لوں۔ جب میں، اپنے باپ کے اعضا میں تھی، تم نے بولنا شروع کر دیا تھا اور میں نے رونا ـــــ پھر اکیلی ہندوستان پہنچی، تمھارے ہی حوالے سے۔ تم نے کتنے اشنان کیے ہوں گے ؟

" پر کمینئے حالی تک کنواری ایں۔۔۔ ؟ "

" تم نے اسے انٹرویو دیا تھا نا ؟ "

" ہاں اور کہا تھا کہ گھونگھٹ نہ نکالنا کہ گھونگھٹ میں سارے چاند مر جاتے ہیں "

"اور کون ملا وہاں؟"

"راجندر سنگھ بیدی۔ اُسے موت کے احساس نے گھیر رکھا ہے لیکن جس زندگی سے اس نے مجھے 'جی آیاں نوں' کہا، اُس کے لیے لفظ کہاں سے لاؤں؟ میرے ادیب! جی چاہتا ہے، تیری بھی جوتیاں چرالوں اور جس طرح میں نے سیڑھیوں میں تمھیں کاندھا دیا، اسی طرح تو مجھے اپنے قدموں سے کاندھا دے۔"

"دیویندر ستیارتھی سے ملیں؟"

"ہاں، وہ کہتا تھا ___ سارا میری بیٹی کوتا مرگئی تھی اور میں نے نظم لکھی تھی۔ خدا کی ڈولی۔ لیکن تمھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری کوتا تو پاکستان میں بیٹھی کوتا لکھ رہی ہے۔"

پھر سارا نے اُس کے لیے نظم لکھی۔ "دھی دھوپ"۔ میرے شاعر! میں نے تمھارے ساتھ فٹ پاتھ پر رات گزار دی۔ کسی نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ تم مجھے اپنی بیٹی کہہ چکے تھے

لیکن میں نے تمھیں باپ تسلیم نہیں کیا، کیونکہ باپ ہو کر تم چھوٹے ہو جاتے۔"

"مشاعروں میں جاتی ہو؟"

"ایک مشاعرے میں، میں مہمانِ خصوصی تھی۔ لوگ کرسیوں پر دراز تھے۔ اور داد کا واویلا مچا ہوا تھا۔ ایک شخص کمرے میں داخل ہوا اور کرسیوں کے برابر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں کلام پڑھتے پڑھتے رکی اور اپنا کتبہ چھوڑ، اس آدمی کے پاس آئی۔ "نیچے کیوں بیٹھے ہو؟"

"بیگم صاحبہ! میں دھوبی ہوں۔"

"نہیں، تُو تو میرا رانجھا ہے اور میں تیری ہیر۔"

پھر میں نے اُسے اپنے برابر والی کرسی پر لا بٹھایا

رات اتنی چھوٹی نہیں ہوتی کہ کونے میں رہ سکے اور لفظ بھی اتنے

چھوٹے نہیں ہوتے کہ صرف انسان میں رہیں۔ اسی لیے میں نے ہمیشہ بھونکتے کتے
کو پسند کیا کہ جب تک کوئی بھونکے نہیں، گلیوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

پھر ایک دن اسے ایک خوب صورت خاتون ملی۔ روئی کے گالوں میں
لپٹی، ہانپتی کانپتی، اس کی خوب صورتی ۷۰ کے سن میں تھی۔ سارا اس کی لاٹھی بن گئی۔
اس نے ٹیکسی پکڑی اور بڑھیا کو اسپتال چھوڑ آئی۔ روپے ہاتھ میں تھمائے تو وہ بڑھیا
کہنے لگی:

"بیٹی! یہ نوٹ لے جا کہ یہ مجھ سے زیادہ بوڑھے ہیں۔ یقین نہیں ہے تو
میرے ہاتھوں سے خون نکال کر دیکھ لے۔ ان سرخ نوٹوں سے زیادہ سرخ ہیں؟"

یہ سن کر سارا کا لہو سفید پڑ گیا۔

پھر اس نے ایک اور بات سنائی۔

"میری ایک دوست، اپنے راز میرے پاس رکھا کرتی تھی۔ وہ شوہر سے
چوری کسی اور سے پیار کرتی تھی، اس کا پیار اُسے بلیک میل کرنے پر تُل گیا۔
میں نے کہا۔ ملوا دو۔ ہم ہوٹل میں ملے۔ پھر ایک روز اکیلے میں ملاقات ہوئی۔ وہ
کار میں مجھے اپنے گھر لے گیا کہ مجھے اُس سے اپنی دوست کی تصویریں لینا تھیں۔
میں کامیابی کا کفن اوڑھے خرچ ہو گئی۔ سنسان حویلی اور کتا مجھے گھور رہا ہے۔ میں
سوچ رہی ہوں اُسے کون سی ہڈی ڈالوں۔ میرے انکار پر بھی وہ بھونکتا رہا اور پھر...
"یہ لو اپنی دوست کی ننگی تصویریں۔"

میں نے تصویریں اپنی دوست کو دیں اور کہا "میں نہیں سمجھ سکی کہ
بلیک میل کون ہوا ہے؟"

دھواں ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ کھانسی کے درد کے بیچ میں نے سگریٹ
اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ایک پیکٹ پھونکا جا چکا تھا۔ جب کالے، گاڑھے

دھوئیں سے اس کی آواز ابھری،

میں سڑک پر جا رہی تھی کہ ایک کار آکر رُکی۔ جوابی مسکراہٹ کے بعد میں کار میں شامل ہو گئی۔ کوکا کولا پلاتے ہوئے اس نے دانستہ اپنا بریف کیس کھولا اور اپنی طاقت دکھائی۔ دیکھتے ہی مجھے کسی کی بھوک، کسی کی اُداسیاں، کسی کی تنہایاں یاد آگئیں اور ایک دم بہت سے چہرے میرے چہرے پر چھا گئے۔

اس نے کہا "فلم دیکھو گی؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

اس نے کہا "کلب چلو گی؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

واپسی پر میرے گھر سے چار مکان پہلے اس نے مجھے اتارا، بوجھل قدموں اور بوجھل پرس کے ساتھ میں اپنے کمرے میں آکر گری۔ تین سال تک وہ بھلے مانس میرے غریبوں کو پالتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"شادی کرو گی؟"

میں نے کہا "نہیں، کیونکہ پیسے لینے والی عورت اچھی بیوی نہیں بن سکتی۔"

اُس نے چار بار بیاہ رچایا (کیا بیاہ بھی ڈھونگ ہوتا ہے) چاروں بار طلاق لینا پڑی۔

اس کے بچے ہیں۔

لیکن وہ ان سے محروم تھی۔

بچے؟

"یہ صدر بازار ہے، جہاں انسان اپنی ضرورتیں خریدتا ہے۔ میں نے بریزیئر خریدنے کی ٹھانی، فٹ پاتھ پر قدم رکھتے ہی ایک سنگین گلی شروع ہو گئی۔ لکڑی کے ٹکڑے پر تقریباً ۹ برس کا تازہ جلا بچّہ پڑا ہے اور اس کے پاس ایک کٹورا پڑا ہے۔ میرے سینوں میں اتنا شدید درد ہوا کہ میں اپنا بریزیئر لینا بھول گئی۔ جی چاہتا تھا میرے سینوں سے کم از کم اتنا خون بہے کہ اس کا کٹورا بھر جائے۔ اس کی آنکھوں میں بازار ختم تھا۔ میں اس پر جھکی کوک رہی تھی۔

"بیٹے! تمھیں یہاں کون چھوڑ گیا ہے؟"

"تمھیں کس نے داغا ہے؟"

"اس عالم میں اتنا فقیر کون ہے؟"

پھر میں اپنے جوبن پر آئی اور اسے اپنے سینے سے لگائے گھر کی طرف چل دی۔ بچّہ قبر سے بولا کہ میری کوکھ سے بولا۔

"باجی میں آپ کے پاس رہوں گا مجھے ایک آدمی نے جلایا ہے۔"

باقی گفتگو کسی کی چاپ پر رک گئی۔

"لڑکی! یہ بچّہ مجھے دے دو۔ میں بچّے کا باپ ہوں۔"

میری ہار یہ تھی کہ بچّہ خاموش تھا۔ بچّے کو داغنے والوں نے اسے مجھ سے چھین لیا اور میں تھانے، اور آوارگی کے الزام سے بچتی بچاتی گھر پہنچی۔

"میں جب کبھی اپنے بیٹے کو دیکھتی ہوں، میرے سینوں میں دودھ جل جاتا ہے۔"

دھواں چھٹ چکا تھا اور وہ سگریٹ کا نیا پیکٹ منگوانے کو کہہ رہی تھی۔ سارا سے گفتگو کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ بہت صاف گو تھی۔ خصوصاً جب موضوعِ گفتگو وہ خود ہی ہو تو بات کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ سچ سننا پسند نہیں کرتی تھی بلکہ یوں ہے کہ جھوٹ سن سن کر شاید سچ بھی اس کے لیے بے معنی ہو گیا تھا۔ ایسے میں وہ اپنا اور اپنی شاعری کا دفاع کرتی۔ ایک

تنقیدی نشست میں کچھ "باضمیر" اور "شریف" لوگوں نے اس کی شاعری پر حملے جیسی گفتگو شروع کی۔ ایک جملہ کچھ یوں تھا:۔

" سارا اپنے جسم میں اور اپنی شاعری میں تمیز پیدا کرو"۔ یہ شاید کوئی تنقیدی پہلو نہیں تھا محض گالی تھی۔ اس نے اسے برداشت کرنے کی پوری کوشش کی اور بس اتنا کہا۔

" صاحب! میں تو بے ضمیری لکھتی ہوں۔ مجھے کیا پتا تمیز اور ضمیر کسے کہتے ہیں۔ اس لیے میری نظم پر صرف بے ضمیروں کو بولنے کا حق ہے... میں تو صرف بکرا پیڑی سے آنے والی آوازوں کو لکھتی ہوں"۔

یہ سن کر وہاں موجود تمام بکرے سہم گئے...

سارا کی زندگی کو کسی ترتیب سے بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ شادی کا حادثہ اس کی زندگی میں چار بار پیش آیا۔ لیکن یہی اس کی کُل سوانح عمری نہیں ہے۔ اس کا المیہ صرف شریف شاعر ادیب نہیں تھے۔ اُس کا المیہ یہ بھی تھا کہ ماں کے بدن سے بھی اس کا جھولا بچھڑ گیا تھا۔ ماں کے لفظ بھی شک سے بھر گئے تھے۔

" تم جانتے ہو، ماں کے جسم سے جھولا بچھڑ جائے تو کیا ہوتا ہے ؟"

" نہیں، کیونکہ میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا"۔

میں دراصل اس موضوع کو ٹالنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنی زبان پر انگارے رکھنے کی عادی ہو چکی ہے۔ شاید بڑا چٹپٹا ذائقہ ہوتا ہے اس کا۔ کہنے لگی:۔

" بتاؤ، کوئی کسی کو گوٹ سمجھے تو وہ زیادہ سے زیادہ کتنا بڑا کھیل، کھیل سکتا ہے؟"

" گوٹ جتنا"۔

شاید میرا جواب اُسے پسند نہ آیا۔ اس نے خود ہی موضوع بدل دیا۔ میں سمجھ رہا تھا۔ وہ اپنے ان بچوں کے بارے میں باتیں کرنا چاہتی ہے۔ جو اس سے چھین لیے گئے تھے لیکن اس کی زبان سے یہ سب کچھ سننا آسان نہیں تھا۔ چند

روز بعد اس کا خط ملا۔ شاید وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔

" طبیعت بہت خراب ہے سر میں ناقابل برداشت درد رہتا ہے چلتی ہوں تو چکر آتے ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا، کہاں آرہی ہوں۔ کہاں جا رہی ہوں۔ لگتا ہے موت کو قریب دیکھ رہی ہوں۔ بچّوں کے وہی پُرانے چہرے، شرارتیں، اُن کی چیخیں، برابر دل پر دستک دے رہی ہیں۔ جانے وہ کیا کر رہے ہوں گے، رونا تو وہ اب تک بھول چکے ہوں گے۔ آج امّی سے چھپ کر پہر دل روتی رہی۔۔۔ بھائی جان کی آنکھیں بھی پچھلے کچھ دنوں سے فارسی کی طرح ہو گئی ہیں۔"

لیکن بچّے۔۔۔

پھر کافی دنوں تک اس کا پتا نہ چلا۔ ایک دوست سے سنا، پنجاب چلی گئی ہے۔ پھر اسی دوست سے معلوم ہوا، پنجاب سے واپس آگئی ہے۔ دہلی سے امرتا پریتم جی کے تین خط آچکے تھے کہ سارا کی خیریت کی اطلاع دو، ایک خط خود اس کے نام بھی تھا لیکن وہ ملنے نہ آئی۔ میں سمجھا شاید ناراض ہو گئی ہے کیونکہ میں نے ایک بار اس کے بچّوں کا ذکر ٹال دیا تھا۔ اچانک ایک روز شبنم کرمانی کے یہاں اس سے ملاقات ہو گئی۔ بہت خوش تھی۔ اس نے اپنے بیگ میں سے ایک ڈائری نکالی۔

" دیکھو میرے بیٹے نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا ہے۔ میرے بچّے۔۔"

میں نے کہا " سارا! اسی طرح خوش رہا کرو۔"

شاید اُسے پھر اصلیت کا اندازہ ہو گیا۔ اُداس ہو کر کہنے لگی:۔

" میں بہت ہنسنا چاہتی ہوں۔ بہت مسکرانا چاہتی ہوں لیکن پھر شاید میرے ہونٹ جھوٹے ہو جائیں۔"

میں خاموش ہو گیا سمجھتا تھا، جھوٹ موٹ کا ہنسنا سچ مچ کے رونے سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔۔۔

اپنے آپ کو بھی اس اذیت سے بچانے کے لیے میں نے کہا "کوئی شعر سناؤ ۔"

اس نے شعر سنایا :۔

سنگ مرمر کے پھولوں میں
مُردہ آنکھیں، زندہ ہاتھ
آنکھیں . . . آنکھیں . . . زندہ آنکھیں . . . مَری ہوئی آنکھیں . . .

" تمھاری شاعری میں آنکھوں کا اتنا ذکر کیوں ہے ؟"

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس سوال کے پیچھے کون سی قیامتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اگر مجھے اپنے سوال کی اہمیت کا ذرا بھی احساس ہوتا تو میں یہ سوال پوچھنے کی ہمت ہی نہ کرتا ۔

" آنکھیں . . ." اس نے ہولے سے یہ لفظ دہرایا "ہاں آنکھیں۔ میری شاعری میں بہت اہم ہیں ۔"

اُس نے ایک ایک لفظ پر جیسے زور دے کر کہا۔ میں نے دیکھا اُس کی آنکھیں زخمی شیرنی کی آنکھوں جیسی ہوگئی ہیں۔ ایسا لگتا تھا، کسی نے اُس کی آنکھوں میں خنجر بھونک دیا ہو۔ لہولہو آنکھیں . . . پھر وہ ہنس کر بولی :۔

" چھوڑو بھئی، آنکھیں کبھی آواز نہیں رکھتیں، فاصلے دہراتی ہیں ۔"

" پھر آنکھیں ؟"

فلسفہ ؟

" فلسفہ نہیں، زخموں کا نوحہ، عورت کی آزادی کے نعرے کو فیشن کی طرح اوڑھنے والی خواتین کیا جانتی ہیں کہ عورت کی مجبوری، جسے چار مرتبہ رُسوا کیا گیا، جس کے بچے اس سے چھین لیے گئے اور جو اپنے مرتے ہوئے بچّے کو کفن بھی نہ دے سکی، اور اب اس کی قبر ڈھونڈتی ہے۔ اور آنکھوں کے نوحے لکھتی ہے۔ لیکن لوگ بڑے بے رحم اور سنگدل نکلے۔ وہ اس کے رحم میں اپنی آنکھیں رکھنا چاہتے تھے۔ جس کے رحم سے ٹوٹے کھلونوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں اور

جس نے کائنات کے رحم میں ایک چیخ رکھ دی تھی۔ سارا نے اپنے تمام لفظ اپنے لہو سے لکھے اسی لیے اُسے فلسفے اور شاعری کے قواعد کتابوں سے نہیں چرانا پڑے۔"

سارا بڑی کڑوی تھی، لیکن سچائی کی شراب تھی جنھیں اُس نے اپنی زمین سے سینچا تھا، وہ ہمیشہ غلیظ مٹی سمجھ کر، اُسے اپنی اپنی کیاریوں میں ڈالتے رہے۔ اس کے لکھنے کے لیے کائنات کا کورا کاغذ چھوٹا پڑ جاتا ہے۔

"آنکھیں؟"

"پیاس کے کانٹے پیس کر میری آنکھیں بنائی گئی تھیں۔"

"اچھا آنکھوں کا ذکر چھوڑو، چلو یہ بتاؤ تم نے شاعری کیسے شروع کی؟"

آج میں یہ کیسے سوال کر رہا تھا۔

"تم نے اپنے پہلے سوال کے صرف لفظ بدل دیئے ہیں۔ سوال نہیں بدلا۔"

پھر اس نے شاعری شروع کرنے کی کتھا سنائی:۔

اسے سننا انگاروں کو آنکھوں پر رکھ کر، بدستور دیکھے جانے کی جرأت کرنے جیسا تھا۔ یہ پانچ سال یا شاید ساڑھے پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ فیملی پلاننگ میں ایک ملازمہ۔ وہ ایک شاعر تھا اور اس کے ساتھ اسی دفتر میں کام کرتا تھا۔ سارا بڑی پکّی نمازی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھنا گناہ سمجھتی تھی۔ گھر سے دفتر تک کا راستہ بڑی مشکل سے یاد کیا تھا۔ لکھنے پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا صرف اتنا جانتی تھی کہ شاعر لوگ بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک شام، شاعر نے کہا۔ "مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔"

پتا نہیں، سارا کی گھٹن کتنی صدیاں پرانی تھی کہ وہ ایک روز اُس کے ساتھ ریسٹورنٹ تک چلی گئی۔ یہ ملاقاتیں بڑھ گئیں۔

ایک روز اُس نے پوچھا۔ "مجھ سے شادی کرو گی؟"

اس سے اگلی ملاقات میں شادی طے ہوگئی۔ اب قاضی کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس نے شاعر سے کہا، "آدھی فیس کے پیسے تم کہیں سے ادھار لے لو۔ آدھی کے میں لے لیتی ہوں اور چونکہ میرے گھر والے شادی میں شریک نہیں ہوں گے اس لیے میری طرف کے گواہ بھی لینے آنا۔"

پھر اس نے ایک دوست سے اُدھار کپڑے مانگے اور مقرّرہ جگہ پر پہنچی اور نکاح ہو گیا۔

قاضی صاحب نے مٹھائی کا ڈبّا منگوا لیا تو دُلہا اور دُلہن کے پاس چھ روپے بچے۔ جھونپڑی تک پہنچتے پہنچتے دو روپے رہ گئے۔

وہ گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ شاعر نے پوچھا "دو روپے ہوں گے؟"

اُس نے دو روپے دے دیئے۔

پھر ارشاد ہوا "ہمارے یہاں بیوی نوکری نہیں کرتی۔"

چنانچہ اُسے نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

گھر میں پڑھے لکھے لوگوں کا ہجوم رہتا۔ شاعر، ادیب، نقّاد، ادبی مسخرے۔ وہ سب ایلیٹ اور سارتر کے لہجے میں بات کرتے۔ سارا کے ضمیر میں علم کی وقعت تو تھی ہی اس لیے وہ ساری جھوٹی باتیں بڑے ذوق وشوق سے سنتی لیکن اس کے باوجود وہ کبھی کبھی بھوک برداشت نہ کر پاتی۔

"روز گھر میں فلسفے پکتے اور ہم منطق کھاتے۔"

پھر ایک روز انھیں جھونپڑی سے نکال دیا گیا۔ یہ بھی پرائی تھی۔ ایک مکان کرائے پر لیا۔ وہاں وہ فرش پر بیٹھی دیواریں گنا کرتی اور اپنے جہل کا شکار رہتی۔

اُسے ساتواں مہینہ تھا۔ اچانک شدید درد اٹھا۔ علم کے غرور میں وہ آنکھ جھپکے بغیر چلا گیا۔ جب اس کی چیخیں اور بڑھیں تو مالکن نے آکر دیکھا اور اسے اسپتال چھوڑ آئی۔

"میرے ہاتھ میں درد اور ایک ایک روپے کے پانچ کڑکڑاتے نوٹ تھے..." تھوڑی ...... دیر کے بعد لڑکا پیدا ہوا۔ شدید سردی تھی اور بچے کو لپیٹنے کے لیے ایک تولیہ بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے بچے کو اس کے برابر اسٹریچر پر ڈال دیا۔

"تم نے اُسے دیکھا تھا؟"

"میں نے دیکھا۔ بچے نے آنکھیں کھولیں، چند ثانیے مجھے دیکھا اور کفن کا نے چلا گیا۔ بس اُس دن سے میرے جسم اور میری روح میں آنکھیں بھر گئی ہیں۔"

اب اس کے پاس پانچ روپے اور مردہ بچہ تھا۔ اس نے سسٹر سے کہا۔

"میں گھر (؟) جانا چاہتی ہوں۔ گھر میں کسی کو علم نہیں ہے کہ میں اسپتال میں ہوں۔"

سسٹر نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا اور بولی:۔

"تمھارے جسم میں ویسے ہی زہر پھیلنے کا ڈر ہے۔ بہتر ہے بستر پر پڑی رہو۔"

"سسٹر میرے پاس فیس کے پیسے نہیں ہیں۔ میں لے کر آتی ہوں۔ اس کے بغیر میرے لیے اسپتال میں رات رہنا ممکن نہیں ہے۔"

میں سارا کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں وہ جو کچھ بتا رہی ہے قابلِ یقین نہیں ہے لیکن وہ کچھ بتا رہی ہے مشکل یہ ہے کہ سچ ہے۔

اس نے نرس سے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"تمھارے پاس میرا مردہ بچہ امانت ہے۔ میں پیسے لے کر آتی ہوں۔" اور وہ ایک جنون کی کیفیت میں سیڑھیاں اُترنے لگی۔ اُس کا بدن بخار سے جل رہا تھا وہ بس میں سوار ہوئی۔ گھر پہنچی۔ اس کے سینے میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اتنے میں شاعر اور دوسرے منشی حضرات وارد ہوئے۔ سارا کا رنگ زرد تھا۔ وہ بری طرح نڈھال تھی۔

پورا واقعہ سُن کر میں دہل گیا۔ سارا کی نظموں کا پس منظر کتنا ہولناک تھا۔
آنکھوں کے علاوہ اس کی گفتگو اور نظموں کا اتنا ہی اہم حوالہ "ماں" بھی تھا۔ وہ اکثر
ماں کے بارے میں گفتگو کرتی۔ وہ شکایت آمیز لہجے میں ماں کے درد کی باتیں کرتی۔
"ماں میری نظموں سے خوش نہیں ہے۔" وہ اکثر کہتی۔ پھر اسی ماں کے کہنے پر اس
نے چوتھی بار اپنا گھر (؟) آباد (؟؟) کرنے کی کوشش کی، یہ کوشش بھی اسے راس
نہ آئی۔ اور اسے پھر ماں کی دہلیز پر واپس جانا پڑا۔ ماں شاید اس صدمے کو سہہ
نہ سکی اور چپکے سے گزر گئی۔ ایک دن۔

چوتھی بار طلاق اور ماں کے انتقال کی خبریں ایک ساتھ چھپیں۔
ماں کی موت اُس کے لیے ناقابلِ برداشت صدمہ تھا۔ بہت دنوں
تک وہ اس صدمے کو برداشت کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اسے ماں کے
گھر سے بھی جانا پڑا۔ ایک بار پھر واپس آنے کے لیے۔ اور اس نے اپنے
درد، اپنی تنہائی، اپنی موت کا ماجرہ امرتا پریتم کو کہہ سنایا کہ وہی اس کی ساری
باتیں سنتی تھی ——— اور سُن کر رو پڑتی تھی ———
سارا نے لکھا۔

امرتا!

" زمین رہنے کے لیے تھوڑی اور دوڑنے کے لیے بڑی ہوتی ہے۔" ابھی
امّی کو روح ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے۔ سارا خاندان اکٹھا تھا۔ میری بہنیں،
میرے بھائی موت کی طرح سیاہ ہو رہے تھے۔
کانوں کی میت بھری چٹائی کے تنکے کچھ یوں چھپے!
" تمھاری وجہ سے سارا، تمھاری وجہ سے ہماری ماں کا انتقال ہوا ہے۔"
ماں ابھی چٹائی پہ موجود ہی تھی کہ نہلانے والی نے کہا!
" اِس کے بچّے اس کے کان میں تین بار اپنا دودھ بخشوائیں!"
خیر تمام بہن بھائیوں نے باری باری دودھ بخشوایا۔

جب امّی حیات تھیں تو میں نے کمرے کی ایک دیوار پہ لکھا ہوا تھا۔
"کانٹے پر کوئی موسم نہیں آتا"
امّی اکثر لڑا کرتیں اور کہتیں یہ دیوار سے مٹا دو۔ "کانٹے پر موسم آتا ہے"

خیر میں بھی بظاہر امّی کے کان میں دودھ بخشوا رہی تھی لیکن میں
نے امّی کے کان میں یہ کہا :۔
"امّی! تم ٹھیک کہتی تھیں، کانٹے پر موسم آتا ہے !!!
امّی جب ڈولی میں وداع ہو گئیں تو سارا خاندان میرے گرد جمع ہو گیا:
" ہم تمھیں اِن اینٹوں سے رہا کرتے ہیں۔ تم نے لکھ لکھ کر پورے خاندان
کی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ اخباروں کی سرخیوں سے ہمارا گاں رگاتی رہیں؟ ہمارے
دشمن، ہمارے شریک اخبارات لیے پھرتے ہیں تم نے امّی کے عشق کا واقعہ
کیوں لکھا؟ کہ وہ تمھارے والد سے پنگھٹ پر ملا کرتی تھیں۔ اب تو اُسنے بخش دو"
میں سوچنے لگی میری ماں تو ایک عظیم عورت تھی کہ اس نے اپنے خاندان
کو خیر باد کہا اور چھپ کر میرے والد سے شادی کر لی۔ اُس دور میں تو یہ بات اور
مشکل رہی ہو گی۔
خیر امرتا! مجھے اُس گھر سے نکال دیا گیا اور کہہ دیا گیا "کوئی ادیب، شاعر،
اخباری نمائندہ ہمارے گھر نہ آئے" اور ہم تمھیں عاق کرتے ہیں۔"
میں مسکرائی اور پوچھا! "کس پرا پراٹی سے ؟"
"تم رات گئے گھر واپس کیوں آتی ہو ؟"
میں نے کہا "بھائی! علم گھونگھٹ میں رکھا ہوا چہرہ تو نہیں۔ مجھے پڑھنے
کے لیے مزدوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا کرو گے؟ زیادہ سے زیادہ عزت بھری
روٹی سے محروم کر دو گے ؟ بھائی میری روٹی میں اپنا منکہ نہ رکھ۔
بھوک کی ماچس روٹیاں لگاتی ہے اور دیکھتی ہے ابھی کتنے گھر کا آٹا رہ گیا ہے

بھائی! کاغذوں پر میں اپنے لچھّن لکھتی رہوں گی۔

"پھر میں نے سوال کیا" کیا میں امّی کے چالیسویں تک یہاں رہ سکتی ہوں؟"

"تم اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔"

میں نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور سڑک پر چلنے لگی۔ آوازوں کا ایک قافلہ میرے ساتھ چل رہا تھا۔

"اس کا کیا ہے یہ تو کہیں بھی سو سکتی ہے۔"

"اچھا ہے پاگلوں کی طرح سڑکوں پر پھرے۔"

"ایسا نہ کریں کہ اسے پاگل خانے داخل کروا دیا جائے؟!"

یہ باتیں سن کر یا ویسے ہی مجھے خون کی الٹیاں آنے لگی تھیں۔

یہ اخباروں کی سرخیاں تھیں امرتا!

کیا یہ لوگ اُجلے لوگ یہ بات بھی بھول گئے تھے کہ بعض اوقات میں بالکل ہوش میں نہیں ہوتی۔ بلکہ کئی بار خود مجھے پاگل خانے داخل کروا کے آتے رہے۔

ایسا نہ ہو سینکڑوں مردوں کا دُکھ میرے بدن میں اتر آئے۔

شاعر و منشی حضرات کے یہاں جاتی ہوں تو ایک سُرخی اخبار میں لگی ہوتی ہے کہ سارا نے فلاں رات فلاں شاعر کے ساتھ گزاری۔

لوگ اکیلی عورت سے کتنا ڈرتے ہیں!!

میں اپنی ایک دوست کے ہاں چلی گئی۔ اس نے گھر کی ایک چابی مجھے دے دی اور کہا "تم یہاں رہو۔" میں رہنے لگی۔ چند روز بعد میں نے اپنی دوست سے کہا "میں نے تمہارے دل سے کاغذ کالے۔ ان کاغذوں کی زبان ردّی سے بھی کم تھی۔

"مجھے یہ قالین اچھے نہیں لگتے تمہاری گاڑی کا ہارن جب بھونکتا ہے تو مجھے بڑی گھٹن محسوس ہوتی ہے دوست! تم "تحریکِ نسواں" چلاتی ہو۔

تمھیں بڑی بڑی ایڈ ملتی ہے اور تم ان پیسوں سے شراب پی جاتی ہو تمھارا گُناہ بھی کورا ہے۔ گُناہ کا بھی ایک مذہب ہوتا ہے۔

تمھاری ہنسی تک مصنوعی ہے! اور میری یہ زیبائش نہیں!! یہ لو چابی میں جا رہی ہوں، اس سے تو بہتر ہے میں کسی فقیر کیساتھ رات گزار لوں۔

میں اپنی ایک بہت ہی اچھی دوست رضیہ کی جھونپڑی میں رہنے کیلئے چلی گئی۔ اُس نے میرا بہت خیال رکھا۔ آدھی آدھی روٹی ہم دونوں کھا لیا کرتے تھے۔ خیراتی اسپتال سے دوا لے آیا کرتے تھے۔

اسی گھر کا واقعہ ہے:

اچانک گلی میں شور اٹھا۔ دیکھا باہر بہت سارے لوگ کھڑے ہیں۔

"آپ نے جوان عورت کو گھر کیوں رکھا ہوا ہے جی؟"

"ویسے بھی یہ کوئی شریف عورت نہیں لگتی۔ اس کا لباس جھونپڑیوں والا نہیں ہے۔ اسے یہاں سے نکالیں، جانے کہاں سے بھاگ کر آئی ہے۔"

میں نے جھونپڑی کو بڑے غور سے دیکھا! اور کہا! "اے جھونپڑی تیرے پاس بھی تنکوں کا موسم نہیں ہے۔"

اور اے جھونپڑی تو مجھ سے شاید اس لیے خفا ہے کہ جب میں تیرے گھر آئی، میرے ہاتھ میں ایک بھی تنکا نہیں تھا۔"

پھر ایک نشست میں ایک شاعر نے کہا "سارا صاحبہ! اخبر پڑھی تھی کہ آپ کو گھر والوں نے عاق کر دیا ہے۔ آپ میرے گھر پر رہیئے!"

میں نے اُسے گنتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ہر کوئی کہتا ہے ہمارے گھر رہیئے۔"

پھر امرتا! ایک روز میں بہت بیمار ہو گئی۔ اسپتال والوں نے داخل کر لیا۔ بھائی منظور کو پتا چلا تو وہ مجھے واپس زمین کے ایک ٹکڑے پر لے آئے۔ جس کا نمبر ہے۔۔۔

پھر زندگی میں اُس سے اور بھی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کے خط آتے رہے۔ وہ عجیب و غریب حالات سے گزرتی رہی۔ اس کی بیماری بڑھ گئی۔ کچھ مشترکہ دوستوں نے اُس کا علاج کرانا چاہا۔ ایک بار اُسے ڈاکٹر نور جہان کاظمی کے پاس لے گئے لیکن وہاں دوسری بار جانے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ ایک بار اس کی حالت بہت بگڑی تو ہم ڈاکٹر ہارون کے پاس پہنچے۔

"باری کے بغیر اسے اندر کیوں آنے دیا" ڈاکٹر ہارون اپنے چپڑاسی پر برس پڑے۔

سارا پر اس کا شدید ردّعمل ہوا اور اس نے وہاں ایک منٹ کیلئے بھی رُکنے سے انکار کر دیا۔ اکثر اس کے بارے میں اطلاع ملتی کہ وہ ان دنوں جناح اسپتال کے فلاں وارڈ میں ہے۔ کئی بار اس کے اپنے خط سے معلوم ہوتا کہ وہ بیمار تھی اور اسپتال میں تھی۔

اس سے بہت عرصے تک ملاقات نہ ہو پاتی۔ ایک بار وہ آئی تو پوچھنے لگی "تم عزت کو کتنا جانتے ہو؟"
میں نے کہا "تمھارے جتنا"

ایک اور ملاقات میں اس نے بڑے اُداس لہجے میں کہا تھا:
"عورت کو اکثر اپنی مرضی کیخلاف کسی نہ کسی چھت کے تلے رہنا پڑتا ہے لیکن اگر وہ اپنی مرضی کے مطابق بھی کسی چھت کی پناہ لے لے تو کوئی بار وہ بھی اُسے راس نہیں آتی . . ."

یہ اُس کی تکلیف اور اذیت کے ناقابلِ برداشت دن تھے۔ اس کی طاقت ور تخلیقی شاعری نے اسے اپنے ہم عصروں میں ناقابلِ قبول بنا دیا تھا انھوں نے اُس کے لیے بہت سی گالیاں ایجاد کرلیں۔ بیماریاں اس پر آئے دن الگ حملے کرتی رہتی تھیں لیکن وہ لکھتی رہی، صبح و شام لکھتی رہی۔ اس کی زندگی میں چار شادیوں کے ناکام تجربوں نے اگرچہ زہر گھول دیا تھا جو اُس کی

رگ رگ میں سرائیت کرچکا تھا لیکن اس نے ہرناکامی کو اپنی سفاک، بے ریا نظموں کا تجربہ بنا دیا۔ تکلیف کے اِن دنوں میں امرتا پریتم سے اس کا مسلسل رابطہ، اس کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ بن گیا۔ امرتا پریتم نے اس کی نظموں کو "جلتے لفظ" کہا، اور ان کے میگزین کے ذریعے سارا کی شہرت پہلے بھارتی پنجاب میں اور پھر ہندی تراجم کے ذریعے پورے شمالی ہندوستان میں پھیلنے لگی۔

۱۹۸۲ میں جب میرا ہندوستان جانا ہوا تو پنجابی، اُردو اور ہندی کے اہم ترین ادیب، اس نئی شاعرہ کی تخلیقی صلاحیتوں پر ششدر تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، بلراج مین را، ڈاکٹر صادق، راجندر سنگھ بیدی، رام لعل، پنجابی، اُردو اور ہندی کی پوری نسل اور کتنے ہی دوسرے لوگ سارا کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتے تھے۔

پھر وہاں اس کی کتاب چھپ گئی۔

امرتا پریتم نے اس کتاب کے ٹائیٹل پر لکھا۔ "سارا شگفتہ کا زندگی نامہ" اور "جلتے لفظ" جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئے۔ جب میں ہندوستان سے سارا کا یہ مجموعہ لیکر آیا تو اُسے پاکر وہ بہت خوش تھی۔ گورمکھی رسم الخط میں چھپے ہوئے اپنے مجموعے کو وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ بار بار مجھ سے پوچھتی تھی۔ "یہاں سے بتانا، کیا لکھا ہوا ہے، اور یہ جہاں سے نیا اسکیچ شروع ہوتا ہے، یہاں میری کون سی نظم ہے؟"

اس میں آرٹسٹ امروز نے سارا کے متعدد اسکیچ بھی بنائے تھے۔ جنھیں دیکھ کر سارا بچوں کی طرح خوش ہوتی۔ اس کی خوشی کی شاید ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ پاکستان میں ایک عرصہ سے اپنی کتاب چھپوانے کے لیے کوشاں تھی۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہندوستان میں سارا شگفتہ کو مقبولیت اور پاکستان میں بدنامیاں ملیں۔ ہو سکتا ہے عورت کے حوالے سے یہ دو معاشروں

کا فرق ہو لیکن امرتا پریتم نے سارا کو جن لفظوں میں اور جس انداز سے سراہا۔ وہ کسی نئے شاعر کے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں تھا۔ امرتا نے سارا شگفتہ کی زندگی کے درد کو پہچانا اور مناسب طریقے سے اس کی اشاعت کی۔ جن دنوں سارا بہت بڑے روحانی بحران سے گزر رہی تھی، امرتا نے اس کی خیریت کے لیے مجھے اور خود سارا کو متعدد خط لکھے، ایک خط میں انھوں نے اُسے لکھا تھا:

"میری بہت پیاری اور حسین دل سارا!

تیری نظموں کے ذریعے میں نے تیری روح کو چھوا ہے اس لیے دل کا سارا پیار تجھے بھیجتی ہوں۔ تجھے جینا ہے، ہر آگ میں سے گزر کر جینا ہے یہی تیرے جلتے لفظوں کو تیرا وردان ہے۔ جی چاہتا ہے تو کہیں نزدیک ہو تو تیرے دکھوں کا زہر اپنی ہتھیلیوں سے دھو دوں۔ بس وعدہ کر کہ تجھے جینا ہے۔

تیری امرتا۔

ایک اور خط تھا

پیاری سارا!

میں دنیا میں کسی کے خط کا انتظار نہیں کرتی۔ صرف تیرے خط کا انتظار کرتی ہوں۔ میری جان! تو بیمار نہیں ہے۔ تو میرے پاس ہندوستان آجا۔ اگر کوئی تکلیف ہے بھی تو اس کا علاج کرالوں گی۔ تجھے اپنے پاس رکھوں گی۔ جتنی دیر تو چاہے۔ تیری نظموں نے مجھے موہ لیا ہے۔ تیرے جیسی زبان دان کبھی صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ وقت کو اگر تیری پہچان نہیں تو یہ قصور وقت کا ہے تیرا نہیں۔۔۔"

ان دنوں مجھے امرتا جی کے جتنے بھی خط ملے، وہ سارا کے ذکر سے، اس کے درد سے بھرے ہوتے تھے۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا:۔

"تجھے سارا کی حفاظت کرنی ہے۔ میرے جیسے دُور بیٹھے دوست تجھ پر یہی ذمّے داری ڈال سکتے ہیں۔ وہ بہت قیمتی روح ہے ..."

کچھ ایسے حالات تھے کہ میں امرتا جی کو بہت دنوں تک اس خط کا جواب نہ دے سکا۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے دوبارہ بے چین ہو کر لکھا:

"میں نے پہلے بھی تمھیں ایک خط لکھا تھا لیکن جواب نہیں ملا۔ پتا نہیں خط ملا ہے کہ نہیں ... سارا شگفتہ کے بارے میں فکر مند ہوں۔ اس کا بھی کئی دنوں سے خط نہیں آیا۔ اس کی صحت اب کیسی ہے؟"

ایک اور خط کے لفظ تھے۔

"کم بخت سارا شگفتہ بہت یاد آتی ہے۔ اس کی نظمیں رُلا دیتی ہیں۔"

اور سارا میرے نام اور امرتا پریتم کے نام اپنے خطوں میں بار بار کہہ رہی تھی:

"میں ہاتھوں سے گری ہوئی دُعا ہوں لیکن لکھتی رہوں گی، موت کی دستک تک۔ لوگ کہتے ہیں شہرت کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔ مجھے لکھنے سے فرصت ملے تو شہرت کی طرف دیکھوں ... جس کے پاس تم جیسا دوست ہو، وہ اپنی آنکھیں مسمار کر سکتا ہے۔"

اور جس لمحے اُسے مرنا تھا، گھر سے نکلتے وقت اس نے اپنی چوڑیاں اتار کر رکھ دی تھیں:

"میرے بیٹے نے پہنائی ہیں ٹوٹ جائیں گی۔" وہ صرف دو دن پہلے اپنے بیٹے اور دوسرے بچوں سے مل کر آئی تھی جنھیں اس کے پہلے شوہر نے کئی برس پہلے قرآن پر ہاتھ رکھ کر دھوکے سے چھین لیا تھا اور جن کے لیے وہ اتنے دنوں جی پائی۔

جب اس کا جسم دو ٹکڑے ہو کر گرا تو اس کی ٹوٹی ہوئی چپل، پٹڑی کے

تاروں میں پھنسی ہوئی رہ گئی۔ اس لمحے اس نے جینا چاہا تھا۔۔۔

حیرت ہے اخبارات کے دفتروں میں اس کی زندگی اور اس کے آرٹ کے بارے میں کوئی ریکارڈ نہ تھا۔

'ڈان' سے حضور احمد شاہ کا فون آیا: "سارا کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں۔"

میں نے مطلوبہ معلومات فون پر ہی لکھوا دیں۔

'جنگ' لاہور کے لیے ہمارے دوست محمود شام نے فون کیا "سارا کی موت کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟"

میں ششدر تھا اس سوال کا کیا جواب دیتا کہا "آپ کو اسکی ایک نظم سناتا ہوں اور اس نظم کی ایک سطر تھی:

"میں اپنی قبر لوں ساہ لیندیاں سُن رہی آں۔۔۔"

اور اپنی قبر کی آواز وہ بہت دنوں سے سن رہی تھی۔ سارا ہمیشہ متضاد خبروں میں رہی۔ زندگی میں بھی اور زندگی کے بعد بھی۔ اس کا مطلب ہے موت بھی آخری فیصلہ کُن عنصر نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے سارا تھی، ہے اور رہے گی۔ اس کا مطلب ہے۔۔۔ ہم کوئی بات بے مطلب نہیں سوچتے اور بے مطلب جمع نہیں ہوتے۔ اس شام الورسن رائٹے کی دعوت پر ہم جمع ہوئے تاکہ سارا کے لیے مل کر روئیں۔ میری آنکھیں نم نہیں تھیں۔ میری آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔ میرا چہرہ ویران نہیں لگتا تھا لیکن میرے علاوہ جتنے لوگ تھے، جتنے چہرے تھے، سب دکھی، اُداس، ویران اور اُجڑے ہوئے تھے۔ وہاں وہ لوگ بھی تھے۔ جن کے بارے میں سارا نے بار بار کہا تھا:

"بے چارے، عزت زدہ جھوٹے ۔۔۔ زمین پر صرف بل ڈھونڈنے نکلے ہیں۔ میں ایک ایک کا نام جانتی ہوں لیکن فی الحال صرف "عرف" کہتی ہوں۔۔۔ اپنی ذات پر طغرے سجانے والے۔۔۔"

انور سن رائے کہہ رہے ہیں: "میرا اور عذرا کا سارا سے آٹھ برس پرانا رشتہ تھا۔ جن کے بہت دعوے تھے اُس کی دوستی کے، اُس کی قربت کے، وہ آگے آئیں اور اس کا مجموعہ کلام چھاپ دیں۔ جو کام وہ پورا کرنا چاہتی تھی، اُسے پورا کریں . . ."

افتخار جالب ٹوٹے ہوئے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہے ہیں۔
" جو اس کی عظمت کے قائل ہیں۔ اب اس کا کلام چھاپنے کے لیے عملاً کچھ کریں۔ اس نے نئی طرح کا شعر لکھا، بہت سی بدنامیوں کے ساتھ سارا کا جسم دفن ہو چکا ہے لیکن اس کی روح ہمارے سامنے ہے۔ اس نے عورت کی انفرادیت کے قیام کی جانب سفر کیا۔ . ."

احمد ہمیش فرما رہے ہیں: "سارا کی شدید خواہش تھی کہ پاکستان میں اس کا مجموعۂ کلام چھپ جائے۔ اپنی موت سے بیس دن پہلے بھی اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس کے مجموعہ کی کتابت اس کی زندگی میں ہی ہو چکی تھی۔ میں نے اُسے حساب لگا کر بتایا تھا کہ مزید چھ ہزار روپے خرچ ہوں گے۔"

چھ ہزار . . .
چھ ہزار ایک

چھ ہزار تین

سارا! تیرے نام کی بولی لگ رہی ہے۔ تیری موت کے بعد بھی۔
لیکن احمد ہمیش کا بیان جاری ہے۔ وہ سمجھ دار، سیانے آدمی ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں کریں گے۔ سو وہ ارشاد فرما رہے ہیں "لیکن اسکی کتاب چھپوانے کے سلسلے میں کوئی ایسی بات نہیں ہونا چاہیے جس سے ظاہر ہو کہ اُس پر ترس کھایا جا رہا ہے۔ یہ اس کے شایانِ شان نہیں ہو گا۔ . ."

سارا! تم نے اپنے خطوں میں بار بار نقّادوں، دانشوروں اور شاعروں کے بارے میں تلخی سے لکھا تھا۔ ہر ٹیلی فون کال پر تم ان کا نام لیکر رو پڑتی تھیں۔ ہر ملاقات میں تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم آئندہ ان لوگوں سے نہیں ملوگی۔ تم کہا کرتی تھیں:۔

" اتنی بیماری کی حالت میں بھی یہ لوگ میرے بُت سے ٹوٹے کنکر مجھے مارتے ہیں۔ حالانکہ آج کل میں کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی اور کوئی مکالمہ نہیں کرتی۔ میرے رحم میں اپنی آنکھیں کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ کائنات کے رحم میں، میں نے ایک چیخ رکھ دی ہے۔"

اور تمھارے رحم سے، سارا! ٹوٹے کھلونوں کی چیخیں آتی تھیں۔ تم نے بہت تلخ لہجے میں کہا تھا۔

" اس وقت پاکستان کے جتنے شاعر اور نقّاد ہیں مثلاً۔۔ تک ایک مصنوعی زندگی کا شکار ہیں اور کم ظرف آدمی کی فطرت سے زیادہ یہ لوگ چھوٹے ہیں۔ بہت قریب سے دیکھا ہے میں نے لٹریچر فروشوں کو۔

" تو نے میرے نام اپنے ہر خط کے نیچے لکھا ہے"۔ تمھاری تو پکّی دشمن" اسی لیے آج تیرے دوستوں میں سب سے زیادہ خاموش آدمی میں تھا کہ مجھے کم سے کم اداکاری کرنے کا سلیقہ تو آتا ہے اور یہ بے ریا لوگ، یہ بے لوث دوست، آج تیرے بارے میں، تیری نظموں کے بارے میں، تیرے چھوڑے ہوئے قرضوں اور قرض داروں کے بارے میں درد سے اور دردمندی سے گفتگو کررہے تھے۔ ذکا الرحمٰن نے کہا:۔

" میں ایسے لوگوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جنھوں نے سارا کا قرض دینا ہے۔ ان میں ایک شاعر ہے جس نے اُس سے تقریباً دس ہزار روپے کا قرض لیا تھا۔ یہاں موجود کتنے ہی لوگ اُس شخص کے بارے میں جانتے ہیں۔ ہمیں اُس

کے قرض وصول کرنے چاہئیں۔"

"۔۔۔۔۔ ہمیں۔۔۔۔۔"

ثروت سلطانہ جس کی حالت اپنی دوست کی موت کے بعد سے بہت خراب ہے۔ تقریباً چیخ پڑی "کیا ان ڈھیٹ لوگوں میں اتنی حس ہے کہ وہ اس کا قرضہ ادا کر سکیں؟"

ایک اور آواز پڑی "لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ شخص یا اشخاص قرض چکانے کی پوزیشن میں بھی ہیں؟"

" اس شخص کا نام لیا جائے۔۔"

" اُسے سب جانتے ہیں۔"

اور سارا، یہ تیرے بارے میں ہو رہا ہے، تو نے جنید اللہ علیم کو یہ رقم دی تھی۔ پتا نہیں اور کس کس کو کتنی کتنی رقم دی تھی۔ یہ تیرے تمام دوست، آج لگتا ہے، جذبات کی رَو میں بہہ گئے۔ تیرے دیئے ہوئے قرض وصول کریں گے تاکہ چھ ہزار روپے کی رقم احمد ہمیش کو دے کر تیری کتاب چھپوائی جائے۔ وہ ایک کمیٹی تشکیل دیں گے۔ شائد اسے ایکشن کمیٹی کا نام دیں لیکن ابھی ذکاالرحمٰن کی تقریر ختم نہیں ہوئی۔ وہ کہہ رہے ہیں: "دوسری بات شطحیات اگر بدنی ہوں تو آدمی مست الست بازاروں میں گھومتا ہے اور قلندر کہلاتا ہے، اگر شطحیات روحانی ہوں تو اس کے لفظ سننے والے کو ہذیان لگتے ہیں۔"

دیکھا! ذکا بھائی بھی اپنا قرض چکا رہے تھے۔ چند روز پہلے انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا "سارا شگفتہ کی شاعری ہذیان ہے۔" اور آج وہ تجھے صوفی بنا رہے ہیں۔ تاکہ تیرے روحانی شطحیات۔۔۔ لیکن قمر جمیل، ہذیان کا لفظ برداشت نہیں کر پاتے اور بول پڑتے ہیں۔ "مجھے اس لفظ پر اعتراض ہے۔"

راشد نور کو یہ پریشانی ہے کہ لفظوں کا یہ کھیل کہیں کسی لڑائی کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو۔ جتنے لوگ بیٹھے ہیں، وہ یا تو ایک دوسرے سے ڈرتے

ہیں، یا نفرت کرتے ہیں یا ایک دوسرے کو کم تر سمجھتے ہیں۔ اُن کے اندر ایک دوسرے کے لیے جو کچھ ہے اُس کو سارا سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ لوگ سارا کے تعزیتی جلسے میں۔۔۔ راشد نور شائد پریشان ہو کر اعلان کرتا ہے۔" اب ہم تعزیتی قرار داد پیش کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے میں آپ کو مرحومہ کی چند آخری نظمیں سُناتا ہوں۔۔۔"

ایک بھاری بھرکم آواز نے راشد کی کمزور آواز کو دبا دیا۔ محسن بھوپالی نے احمد ہمیش کی بات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔" نرسں والی بات، ہم اپنے طور پر فرض کر رہے ہیں۔ ہمیں سارا کی کتاب چھاپنے کیلئے ضرور کچھ کرنا چاہیئے۔ آخر دوستوں نے سرور بارہ بنکوی کی کتاب بھی اِسی طرح اہتمام سے چھاپی تھی۔"

ذکاالرحمٰن: " لیکن سرور صاحب کا معاملہ سارا سے مختلف تھا۔۔۔"

ان کی آوازوں میں اور بہت ساری آوازیں شامل ہو گئی ہیں لیکن محسن بھائی کی اس مداخلت کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اب ان کا کمیٹی میں شامل کیا جانا یقینی ہو گیا ہے۔

اس ساری گفتگو پر مجھے وہی اعتراض ہے جو سارا شگفتہ کو تھا۔ یہ سب لوگ صاف سُتھرے، اُجلے اُجلے، روشن روشن، صاحبِ ضمیر شرفا، آج سارا کو اس کے شعر کو عظیم کہہ رہے ہیں جبکہ اِسی قسم کی ایک "ادبی نشست میں سارا نے کہا تھا۔" صاحب! میں تو بے ضمیری لکھتی ہوں۔ مجھے کیا پتا تمیز اور ضمیر کسے کہتے ہیں؟ میں تو صرف بکرا پیٹری سے آنے والی آوازوں کو لکھتی ہوں۔ میری نظم پر صرف بے ضمیروں کو بولنے کا حق ہے۔"

اس نشست سے پہلے وہ بیمار تھی۔ اُن دنوں اُس سے عجیب مکالمہ ہوا تھا۔

" اب مشکل سے اُٹھتی بیٹھتی ہوں۔ سر میں اکثر درد رہتا ہے۔"

" پھر تم باہر کیوں نکلتی ہو، تمھیں پتا ہے لوگ تمھارے بارے میں کتنی اُلٹی

سیدھی باتیں کرتے ہیں۔"

"کیا میں گھٹ کے مر جاؤں؟ میں اپنی پاکیزگی کا کوئی سرٹیفکیٹ نہیں مانگتی، تم دیکھو میں جہاں جاتی ہوں، اکیلی جاتی ہوں۔ میرے ساتھ کوئی ندیم قاسمی نہیں ہوتا۔ کوئی افتخار جالب نہیں ہوتا۔ میں کیا ہوں، کیا نہیں ہوں، یہ میرے لفظ بتاتے ہیں۔ ان لٹریچر فروشوں کا کیا ہے۔ یہ تو اپنا کلام بھی بیچ دیتے ہیں۔"

"لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمھاری شاعری محض ہذیان ہے۔"

"پہلے انھوں نے چاہا کہ میں شعر نہ لکھوں۔ مجھے ہر طرح سے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن درد سے جب میری آنکھیں پھٹ گئیں اور میں نے اپنے بہتے خون میں پہلی بار قلم کا ڈوبا لگایا تو یہ اسے ہذیان کہنے لگے لیکن امرتا پریتم میری نظم سن کر رو پڑتی ہے کیوں؟"

انھی دنوں سارا کا ایک دردناک خط ملا۔ میری یہ پکّی دشمن، صرف مجھے اور امرتا جی . . . کو اس طرح رو کر خط لکھا کرتی تھی :۔

"چند روز پہلے مجھے احساس ہوا کہ میں تو دہلیز سے بھی زیادہ دور بے قدم رکھنے لگی ہوں۔ چنانچہ کچھ چُٹّے قسم کے شاعروں اور نقّادوں کے یہاں پہنچی اور ان کے اصل میں اتری۔ بہت دنوں سے سُنتی آ رہی ہوں۔ "سارا مجھ سے عشق کرتی ہے۔" "سارا بہت آسان ہے۔" "سارا تو میرے ساتھ . . ." اگر میرے کسی کیساتھ ایسے سلسلے ہوں تو کم از کم میں اتنی سچّی ضرور ہوں کہ بتا دیتی کہ صاحب! آگ ان چرنوں میں لگی ہے . . ."

حیرت ہوئی کہ خط کے نیچے "پکّی دشمن" والا فقرہ موجود نہیں تھا۔

ایک اور خط میں اُس نے اور زیادہ تلخ ہو کر لکھا۔ "عالموں نے اپنی فال نکالی اور میرا نام سرائے رکھا۔"

ہاں، انھوں نے اس کے لیے "بدنام" اور "سرائے" اور "رسوائے زمانہ" جیسی ترکیبیں استعمال کیں لیکن اس پر بھی جب وہ اُسے بے لباس نہ کر پائے تو انھوں

نے جھنجھلا کر اپنا ہی لباس تار تار کر ڈالا۔ اس حمام میں وہ سب . . . ایک "شریف" شاعرہ نے اُسے فاحشہ کا خطاب دیا۔ ایک طغرے شاعر نے اس سے کہا :۔

"نماز پڑھا کرو۔"

حالانکہ اس شاعر کا اپنا روحانی قد جائے نماز سے بھی چھوٹا تھا۔

ایک نقّاد بولا : "بیٹی یہ لچھن اچھے نہیں" اور رومال سے اپنی رال پونچھنے لگا۔

ایک اور نے کہا۔ "وہ بن جل کی مچھلی ہے۔ میں تو اُسے بہن کہہ چکا۔ اب تم نپٹو۔"

یہ عالم، یہ گرگے، یہ کمروں کے باشندے، باعزت پتّھر رکھنے والے نقّادوں کی تالیاں دہرانے والے، سارا کے لفظوں میں "اپنے قد سے بھی چھوٹی داد دیتے ہیں . . ."

اب قمر جمیل اپنی صدارتی تقریر کر رہے ہیں۔ "سارا کا اور میرا تعلّق بیٹی اور باپ کا تعلّق تھا۔ ایسی المناک موت ناقابلِ برداشت ہے۔ اس میں انسانیت کا جوہر سب سے نمایاں تھا۔ غریب کے بچّوں کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتی تھی . . ."

قمر جمیل بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سارا نے قدم قدم پر اپنے عمل سے اس بات کی گواہی دی تھی۔

قمر جمیل کی تقریر کا بقیہ۔

"وہ کسی کے دُکھ کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے غیر معمولی ذہن پایا۔ اسکی تحریریں حیرت ناک بہادری تھی۔ وہ لاشعور میں شاعری کرتی تھی۔ کچھ لوگ اسکی شاعری کو ہذیانی کہتے تھے۔ وہ اعصابی تکلیف میں تو مبتلا تھی لیکن پاگل نہیں تھی . . ."

"پاگل پن بھی بجائے خود ایک انسانی خوبی ہے۔" (ذکاالرّحمٰن کا ٹکڑا)

"... اس کے ذہن سے روشنی کا شعلہ لپکتا تھا۔ انسانی تضادات کا شعلہ، ایک سچی آواز..."

"یہاں عورت وہ ہے جو پردہ کرتی ہے۔ ہنس نہیں سکتی۔ وقت مقرّرہ پر چلتی ہے۔ وقت مقرّرہ پر گاتی ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میری تحریریں پڑھ کر مرد پردہ کرنے لگتے ہیں..."

راشد نور بھرّائی آواز میں سارا کی آخری نظمیں سنا رہا ہے۔ ثروت سلطانہ اور عالیہ فرّخ شاید برداشت نہیں کر پا رہیں اور وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی ہیں۔ دوسرے کمرے میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہیں اور راشد نور اس کی آخری نظم سنا رہا ہے۔

آخری نظم ـــــ؟

اب تعزیت کی قرارداد پڑھی گئی ہے۔

بے حد خوب صورت اور سچّے لفظوں نے فوراً ہی جھوٹے ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور قرارداد پر اعتراضات شروع ہو گئے ہیں۔ یہ قرارداد جسے فراست رضوی نے ڈرافٹ کیا تھا مسترد کر دی گئی ہے اور اس کی جگہ قمر جمیل راشد نور کو ایک نئی قرارداد ڈکٹیٹ کرا رہے ہیں۔ اس قرارداد پر بھی شور اٹھا ہے۔ بحث ہوئی ہے۔ لوگ چیخ چلّا رہے ہیں۔ دوسرے کمرے میں پریشان حال میزبان عذرا عباس، ثروت اور عالیہ کو تسلّی دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لگتا ہے میں اپنی خاموشی میں سے پھٹ پڑوں گا۔ میں کہتا ہوں:۔

"یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے؟"

عذرا دُکھے دل اور کانپتے لفظوں سے کہتی ہے "تماشہ کرنے دیں جو کرتے ہیں۔"

قرض وصول کرنے اور سارا کا مجموعہ چھاپنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دے دی گئی ہے۔ اس میں ثروت کا بھی نام ہے۔ میں حیران رہ جاتا ہوں کہ

ثروت بھی؟

میرے ساتھ اجمل کمال اور آصف فرخی بیٹھے ہیں۔ اجمل کہہ رہے ہیں۔

"ہمیں اندازہ تھا کہ ایسے ہی کریہہ منظر دیکھنے کو ملیں گے۔"

"یہ لوگ سارا کے ساتھ وہی تماشا کر رہے ہیں جن تماشوں سے لڑتے لڑتے اس نے اپنی سانسیں کھو دیں"، آصف فرخی نے اداسی سے کہا۔

یہ سب سچے دوست اور کھرے جذباتی تعلق والے لوگ ہیں۔ سب سے کم دنیا دار۔ یہ دنیا کو بھول کر، اپنی مرحومہ دوست، بہن، بیٹی کی یاد میں بیٹھے ہیں۔ وہ اُس کتاب کی اشاعت کے لیے پریشان ہیں۔ رو رہے ہیں، اُلجھ رہے ہیں، بکھر رہے ہیں۔ اس کی روح کو بھی اذیت پہنچا رہے ہیں۔

سارا کی روح؟

شائد جسم کے علاوہ سارا کی روح بھی ہمارے درمیان نہیں ہے۔ ساری عمر اس کے بدن سے کپڑے کھینچنے والے سماج میں اب اس کے لیے کیا بچا ہے؟ وہ جو قدم بہ قدم عورت کے زخموں پر اپنے بولوں کا مرہم رکھتے خود زخمی ہو گئی تھی، اپنے لیے مرہم ڈھونڈنے پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے!

اسی رات ثروت سلطانہ کہہ رہی تھی، "اس کے گھر میں اسکی ٹوٹی ہوئی چپل دیکھی؟ دیکھو، بے جان چیزیں یہیں پڑی رہ جاتی ہیں اور زندہ چیزیں..."

حیرت ہے زندہ چیزیں ایک دن زندہ نہیں رہتیں...

سیلف پورٹریٹ

سلیم!
امّی روز میرے کمرے سے ردّی نکالتی ہیں اور اکھٹے کرتے ہوئے کہتی ہیں "غلیظ لفظ لکھنا کب بند کرو گی۔"
اس سے پہلے کہ امّی ردّی کو آگ لگائیں، میں ایک لمحے کے لئے ردّی سے زیادہ ڈر جاتی ہوں۔ سارا دِن کوری رہتی ہوں اور پھر رات لکھتی ہوں۔ سچ لکھنے کی وجہ سے لوگ میری پرچھائیں سے بھی خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ اب تو لوگ دبے قدموں میرے کمرے میں چلتے ہیں۔ جیسے یہ میرے بِل سے نکلے ہوئے چوہے ہوں۔ شکر ہے میں صرف "دُھنی" تک سنگسار ہوئی۔
زمین چاہے کتنے پھول بہائے قبر کا منہ بند نہیں کر سکتی" ویسے بھی میں نے کیا کرنا تھا چلے ہوئے کپڑوں کا۔"
تم مل جاتے ہو تو کچھ باتیں ہو جاتی ہیں۔ ورنہ تو جوتی میں پھنسنے والی بات ہے پنجابی نظموں کی کاپی جلد کرو۔ ورنہ سانس کا کیا ہے۔ جانے کہاں اٹک جائے اس لئے جلد ہی کاپی کر دو تا کہ کتابت شروع کی جا سکے۔
تمہیں دیکھتی ہوں تو میری آنکھوں میں کوئی فرق نہیں آتا ہم جاری سانسوں کی قید کاٹ کاٹ کر جانے کہاں چلے جائیں گے۔
تم ادب کے گھر پیدا ہوئے۔ بھلا یہ چھوٹے چھوٹے لوگ تمہیں دکھ نہ دیں تو کیا کریں۔ زندگی تو ادھوری شاخ ہے ہم پھول کہاں رکھتے۔ ہم اپنی زندگی کا سلسلہ ہیں۔ میں بھی اتنا نہیں لکھتی جتنی تم محنت کرتے ہو۔
تمہاری سچائیاں دیکھ کر ہی تو لوگ کڑوے ہوتے ہیں۔ زیادہ پریشان نہ رہا کرو۔ میں دیکھتی ہوں کھیل دکھ سے بڑا ہوتا ہے آؤ گیند کی ہتھیلی ڈھونڈیں۔

تمہاری سارا

احمد سلیم
تم مل جاتے ہو تو کچھ باتیں ہو چکتی ہیں ہم تو اپنی زندگی کا سلسلہ ہیں۔ تم اگر میرا حوصلہ نہ بڑھاتے تو شاید میں سچ سے ڈر جاتی، لیکن تم نے میری خود نوشت سنی اور مجھے ایک انسان جانا۔ جس کے پاس تم جیسا دوست ہو، وہ اپنی آنکھیں مسمار کر سکتا ہے۔ تمہارے گھر تو صدیاں پڑی ہیں۔ باقی رہی صورتِ دیگر تو بہت سے لوگ تم سے پیار کرتے ہیں۔ امرتا کے بعد میں بھی تو تمہاری ہوں۔ پھر آنسوؤں کو ٹھوک دو اور "آنکھ کے دکھ میں شامل ہو جاؤ۔"

وقت کم رہ گیا ہے گھڑیاں خاموش پڑی ہیں۔

سارا

۲۱-۱-۸۲

احمد سلیم!
اب تو مشکل سے اٹھتی بیٹھتی ہوں۔ سر میں درد رہتا ہے۔ بہت تڑپتی ہوں اور ثواب کے بستر پر سوتی ہوں۔ خیال بٹانے کے لئے ریڈیو کھولی تھی تو ایک طغرے نے کہا "نماز پڑھا کرو"

حالانکہ اس کا اپنا قد جائے نماز سے بھی چھوٹا ہے۔ اسے کیا خبر میری عبادت کیا ہے! یہ بہن اور بیٹی کہہ کر اپنے لفظوں سے زنا کرتے ہیں۔ یہ کیسے لوگ ہیں؟ اور لوگوں نے بھی مجھے بتایا تھا کہ میں تو بہن کہہ چکا اب تم نپٹو!

یہ بُرا نہیں سن کر مجھے پھر دورہ پڑا۔ یہ صلہ ہے خدا کا .... میں ماں کی طرح چلتی ہوں اور یہ سب دوپٹے چور ہیں۔ ایک تو بیماری نے آنکھ ناپ رکھی ہے۔ کتنی تنہا ہوں۔ ایک جھونپڑی کا عذاب بھی تھوڑا نہیں ہوتا۔ ساری

زمین پر نبی کی خندق کھدی ہے اور حفاظت دیکھو!

یہ روز کون مرجاتا ہے۔ حالات درست نہیں۔ کبھی دوا ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ یہ تو مُردوں سے کفن کا بہانہ بھی چھین رہے ہیں۔ عذاب ہے۔ مجھے تو انسانوں سے خوف آنے لگا ہے۔ میں بہت خوف زدہ ہوں مکاری میرے بس کی بات نہیں۔ اے رَبّ! میں فانی ہوں اور فنا کو خدا مانتی ہوں۔ گندم مجھ سے زیادہ زندہ ہے۔

اتنی بیماری کی حالت میں بھی لوگ میرے بُت سے ٹوٹے کنکر مجھے مارتے ہیں۔ حالانکہ آج کل میں کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی اور کوئی مکالمہ نہیں کرتی۔ یہ میرے رحم میں اپنی آنکھیں کیوں رکھنا چاہتے ہیں حالانکہ کائنات کے رحم میں، میں نے ایک چیخ رکھ دی ہے۔ میں نے ایک نظم لکھی ہے "جھوٹا پانی، ادھورے بچے"، ایک لائن ہے۔

"میرے رحم سے ٹوٹے کھلونوں کی چیخیں آتی ہیں۔"

اور پھر میرے منہ سے خون شروع ہو گیا لیکن میرے اندر قوت ارادی بہت ہے۔ اس لئے اور زندہ رہنا چاہتی ہوں ابھی کچھ کام باقی ہیں۔ ویسے ٹھیک ہی ہوں۔ لکھ رہی ہوں۔ اس وقت پاکستان کے جتنے شاعر اور نقاد ہیں مثلاً افتخار جالب تک ایک مصنوعی زندگی کا شکار ہیں اور رکم آدمی کی فطرت سے زیادہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ پروین شاکر جس سے میں نے کبھی ملنا پسند نہیں کیا۔ وہ سنا ہے میرے خلاف بولتی ہے۔ لفظ سُنو، فحش باتیں لکھتی ہے اور مردوں سے داد حاصل کرتی ہے۔ آوارہ ہے"

حالانکہ نمائش پسند، کار پسند خود ہے، کیسا وقت ہے، عذاب ہے۔ میں چلی جاؤں گی لیکن کبھی نہیں جاؤں گی۔ میرے لفظ! میں نے اپنے لہو سے لکھے ہیں اور میں شروع بے ضمیری سے ہوتی ہوں اور ہر لفظ بے ضمیری سے

شروع ہوتا ہے ہیں ان کے جھوٹے مکروہ اور غلیظ لفظوں کو پسند نہیں کرتی۔ ایک ڈرائنگ روم میں بیٹھے لوگ جانے کتنی بار گناہ کرتے ہیں یہ اتنا بھی نہیں جانتے۔

میں اپنی پاکیزگی کا کوئی سرٹیفکیٹ نہیں رکھنا چاہتی۔ تم دیکھو میں جہاں جاتی ہوں اکیلی ہی جاتی ہوں میرے ساتھ کوئی ندیم احمد قاسمی نہیں ہوتا۔ عذرا عباس کا افتخار جالب نہیں ہوتا۔ میں ان سب لوگوں سے نفرت کرتی ہوں اور اس سوسائٹی، اس معاشرے پر تھوکتی ہوں۔ حالانکہ یہ بھی ان کی حوصلہ افزائی ہے۔ میں کہاں ہوں، کہاں نہیں ہوں میرے لفظ بتاتے ہیں پھر میں کیسے دعویٰ کروں پارسائی کا کہ میں ابھی تو لکھ رہی ہوں۔ ابھی تو ملاہٹ ختم نہیں ہوئی میں دوسرا اور تیسرا جذبہ کیسے لکھوں۔

بہت قریب سے دیکھا ہے ان لٹریچر فروشوں کو۔ انھوں نے کبھی مجھے ایک لڑکی، ایک عورت سے زیادہ نہیں جانا اور وہ بھی ایک خاموش زاویے سے۔ یہ کھوکھلے پانچ پائی سے بھی کم ہیں۔ سو میرا اکیلے لڑنا اور سفر کرنا اور اکیلے ان سے ملنا مشکل تھا۔ لیکن میں انسانوں کو ایسے ہی پڑھ سکتی ہوں اور تبھی کچھ نہ کچھ دیکھ سکی ہوں۔ پچھلے دنوں جب افتخار جالب نے مجھ سے پردہ کیا۔ تو تو مجھے بہت اچھا لگا۔ اب سوچو! دوسرے لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ میرا باپ اپنی لذت سے مرا تھا، میرے لئے نہیں، پھر میں کسی سور، کسی کتے، کسی بن مالس کو نہیں مانتی اور اگر ان لوگوں نے میرے ساتھ اور گستاخی کی تو ان کے کرداروں پر ایک ایک کتاب لکھ سکتی ہوں۔ ان پڑھ ہوں لیکن علم پڑھ نہیں ہوں۔

سلیم! مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میرے اوپر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں اور اسی عذاب کا شکار جب سے ہوں جب سے لکھ رہی ہوں۔ ایک عام زندگی میں ایک انسان اپنا محلہ اور گلی بناتا ہے۔ مجھے تو ان کے ضمیروں میں گلیاں

بتانی ہیں اور ایک شہر آباد کرنا ہے اور اس شہر کے قرآن میں صرف شیطان کا ذکر ہوگا تاکہ لوگ زمین کے مخالف چل سکیں اور پیڑوں سے سائے کاٹ پھینکیں۔

میں تم سے ملنے آئی تھی۔ خط مجھے مل گیا ہے۔ ایک تم نہیں ملنے۔ شکر ہے اور میری بے ضمیری کا شکر ہے کہ تم جیسا انسان میرے درمیان موجود ہے میں تمہاری تعریف کرنا نہیں چاہتی لیکن تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میرے ہاتھ تمہیں سلام کرتے ہیں۔

امرتا کی اور تمہاری
سارا شگفتہ

احمد سلیم!

اب تو تمہیں بھی حق پہنچتا ہے مجھ پر لعنت بھیجنے کا۔ مگر میں سوچتی ہوں یہ حق کب تمہارے پاس نہیں رہا۔ تم سے اجر چاہوں گی کہ ثروت سارا شگفتہ احمد سلیم کی ہی دوست نہیں بلکہ انسانوں کی بھی دوست رہی ہے اور انسان کتنا قیمتی یا سستا ہے۔ مجھے ابھی اندازہ نہیں۔

تمہاری دوست
سارا

۱۱/۲/۸۲

سلیم!

طبیعت خراب ہے سر میں ناقابلِ برداشت درد ہو رہا ہے اور پھر چلتی ہوں تو چکر آتے ہیں۔ لگتا ہے اب تو شاید سورج دنوں میں گنا جا سکتا ہے۔ جیسے جیسے موت کو قریب دیکھ رہی ہوں بچوں کے وہی پرانے چہرے

شرارتیں، ان کی چیخیں برابر دِل پر دستک دے رہی ہیں۔ جانے وہ کیا کر رہے ہوں گے۔ جانے وہ کیا کر رہے ہوں گے، رونا تو وہ اپنا کب بھول ہی چکے ہوں گے۔ آج امّی سے چھپ کر پہروں روتی رہی۔ اب بھی تقریباً آدھی رات ہو چکی ہے۔ نہ لکھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ بس ایک ہُو کا عالم ہے شبنمیں بنا رہے ہیں سناٹے سانپوں کی طرح۔

بھائی جان کی آنکھیں بھی پچھلے دنوں فارسی کی طرح ہو گئی تھیں کہنے لگے "تم کتنی آوارہ ہو، سگریٹ پیتی ہو۔" بس کیا لکھوں۔

خاموشی کے کٹورے، شرافت کی کتیا ہی تو پالتی ہے۔ چونّی اٹھتی بھی گویا تقدیر ہو کر رہ گئی ہے۔ پتا کرو اگر کہیں سے مفت علاج ہو جائے تو زیادہ اچھا ہے کیونکہ کب تک گدلی آنکھوں کے تالاب میں پھنسی رہوں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ دیکھو مفت کے ہسپتال میں تو موت بھی نہیں آتی۔ امرتا کا خط آیا ہو تو لکھو یہاں بھی سنّاٹا ہے۔۔

تمہاری
سارا

سلیم!
سلام...

میں بہت خوف زدہ ہوں، مجھے انسانوں سے خوف آنے لگا ہے ایسا لگتا ہے مردہ آنکھوں کی سرانڈ میرے لہو میں بھی شامل ہو گئی ہے اور میں بالکل اپنے دیکھنے والے جیسی ہو گئی ہوں۔ جیسے باڑے میں سور دودھ دے رہے ہوں اور پتّھر کو میرا رزق کہا جا رہا ہو اب تو جھوٹ بھی ساتھ چھوڑ گئے سیدھی اور آواز یہ ٹین کی چھت رہ گئی ہے، لیکن اپنی برداشت میں سورج رکھتی تھی ازل کے خراٹے سے راز کبھی خاموش نہیں ہوتے اور بھوک اتنی بڑھ جائے

گی کہ قبروں پر گندم اگانا پڑے گی۔ وہ اپنے جہل سے مجھے اداس کرتا ہے۔ اور میرے کام آتا ہے آنکھیں کبھی آواز نہیں رکھتیں، فاصلے دھراتی ہیں۔ اب صرف داغ بکھنے کی مٹی دریافت کر رہی بیٹھی ہوں۔ کیا روگ کی ساری بیٹیاں بانجھ ہیں؟ ظرف کا شجرہ لکھوں گی تو کم ہو جاؤں گی۔

یہ عالم! یہ گمرگے، یہ کمروں کے باشندے، باعزّت پتھر رکھنے والے اور نقالوں کی تالیاں دھرانے والے اپنے قد سے بھی چھوٹی داد لیتے ہیں۔ کمینے ہیں کہ میں ان کی آنکھوں کی سب سے پہلے کمینگی ہوں۔ کہتی ہوں۔

ہونہہ! رات تو پرندے کے سو جانے سے گہری ہوتی ہے۔

ہونہہ! میں فانی ہوں اور فنا کی ۔۔۔ مانتی ہوں۔

اے ربّ! میں نے اپنے بچوں کے کھلونے کبھی نہیں توڑے۔

اے ربّ! کیا میں تیرا رزق ہوں۔ تو میرا انکا لیتا ہے اور میں تیرا اقرار ہوں میں اپنے جہل سے نیچے چلتی ہوں اور تو اپنے فضل سے حکم جنتا ہے میں بہت کڑوی ہوں لیکن تیری۔ ہوں۔

اے ... ! تو اپنا وقت کہاں گذارتا ہے اور اپنی نیکیاں کہاں رکھتا ہے میں تیری کوکھ میں مروں گی اور زندہ رہوں گی۔

اے رب! پانچ بچے تیرا ضمیر ہیں۔ اے رب! سورج سے کہہ آسمان پر تمیز سے لیے۔ میرے صبر میں زبان دے۔ آدم کا جہل شیطان ہے اور شیطان کا جہل ... ہے۔ میں اپنی کوکھ سے چلتی ہوں اور تیرا نام جنتی ہوں۔ لعنتی ہوں پر تیرا ہاتھ رکھتی ہوں۔ تیرے پانچوں چور میرا ہاتھ چوری کرتے ہیں۔ سورج کی پسنی روز قیامت ہے۔

تمہاری تو یکی دشمن
سارا شگفتہ

جانے آج کیا تاریخ ہے

سلیم!

طبیعت آج بھی بہت خراب ہے۔ بھائی جان کہتے ہیں سگریٹ نہیں تمہاری آوارگی پلاتی ہے۔ بس کیا لکھوں۔ تارے کیسے گنتے ہیں یہ چالیس عزت زدہ چھوٹے کتنے زمین صرف بل ڈھونڈنے نکلے ہیں فالتو جو ہوتے ہیں ایک ایک کا نام جانتی ہوں لیکن فی الحال صرف دعرف، کتنی ہوں بس ننگے پاؤں چلتی ہوں اور مٹی چھوتی ہوں۔ کون اچھوت ہے۔ آئندہ یاد کروں گی اور میدانوں میں اپنا جہل نہیں بھولوں گی۔ تم اپنی ساری شرافتوں سے آؤ۔ میں یہ جھوٹا لباس بھی پھینک دوں گی اور اپنی تمام سچائیوں سے تمہیں آگاہ کروں گی۔ لگتے تو یہ حلالی ہیں لیکن شاید ان کی ماؤں نے صرف آنکھوں سے حرام کاری کی ہے۔ چلو میں تو دودھ دینے والی بکری ہوئی لیکن تم نے مجھے چرایا ہے۔ اپنی ذات پر طعنے سجاتے والے حرام سے پلتے تھے۔ لیکن میں دوپٹہ چور بھائی کا ٹھوٹھا نہیں دھرانا چاہتی۔ ملال تو علم کا نام ہے اسے کیا لکھنا۔ ایک تو حرام زادی ہے اوپر سے خوشبو کے نشے میں اپنے باپ کے پاس سوتی ہے۔

یہ آنکھ کی کمینی پوتی میرے پوتوں کو خراب کرنا چاہتی ہے۔ چھی چھی... خواب بھی چہرہ نواز ہوتے ہیں "تو بہ ہے" اور یہ یہ، یوں یوں، ایسے ایسے ڈرائنگ روم میں چغل خوری اکٹھے بچے جنتی ہے اور حلالی شہور ہے جیسے بے غیرت ہونا ہو آئندہ سے نام لے انشاء اللہ شفا پائے گا۔

سارا شگفتہ

احمد سلیم!

"تاریک دیدوالے نے کہا، اپنے بدن میں تمیز پیدا کرو" میں نے حیرت

سے اسے دیکھا اور کہا "تم میرے ساتھ کب سوئے تھے" یہ ہے علم کا جنگل۔ لوگ
لوگ دام سے زیادہ تو گفتگو ہی نہیں کرتے۔ یہ ہے سوسائٹی۔ یہ کنواری آنکھوں
والے کیا جانیں انسان لکھنا کب شروع کرتا ہے ایک تنقیدی نشست میں
میں نے کہا "صاحب! میں تو بے ضمیری لکھتی ہوں۔ میں ابھی کیا جانوں ضمیر کسے
کہتے ہیں۔ میری نظم پر صرف بے ضمیروں کو ہی بولنے کا حق ہے"
سودا سلف کی بجائے عورت کے بند کھولنے لگتے ہیں۔ تنہائی بھی تو ایک
خنجر ہے۔ جتنی بکرا بیڑی سے آوازیں آتی ہیں۔ تمہیں لکھتی رہتی ہوں۔ کافی
دنوں سے تم سے ملاقات نہیں۔ طبیعت کچھ اداس سی ہے تم سے مل کر کافی حوصلہ
افزائی ہو جاتی ہے، ورنہ تو سنّاٹا ہے۔
رام لعل کا خط آیا ہے وہ بھی بیماری کی وجہ سے پریشان تھے۔ جواب
جلد دو۔

والسّلام
سارا شگفتہ

سلیم!
سورج روز میری عمر پر آنکھ مار رہا ہے بہت دن ہوئے میں نے لکھا تھا
"ہم سر پر کفن باندھ کر پیدا ہوئے ہیں۔ کوئی انگوٹھی پہن کر تمہیں
جیسے تم چوری کر لو گے...."
مگر سب کچھ یہاں نہیں رہ جائے گا۔ راستے میں بیٹھی ہوں لیکن کسی
کا بھی کوئی گھر نہیں ہوتا۔ ہم سب ایک دوسرے سے چھپے ہوئے ہیں اور یہی
سچ ہے آتش دانوں سے اپنے دہکتے ہوئے سینے نکال لو۔ ورنہ آخر دن
آگ اور لکڑی کو اشرف المخلوق بنا دیا جائے گا.... میں اپنے رب کا خیال ہوں
اور مرتی ہوئی ہوں.... بس آواز دہرانا ہی اسم اعظم ہے۔

امرتا بہت یاد آتی ہے۔ اُسے یاد نہیں لیکن میں نے اسی سے اسم اعظم سیکھا ہے۔ سوئیزوں کی کنی پر اپنی زبان چکھتی ہوں۔ کیسی داد۔ کیسا ہجوم کیسی شاعری۔

لگتا ہے سلیم! میں کاغذ اور قلم ہو کر رہ گئی ہوں اور انسان کو بھول رہی ہوں۔ اب تو یہی آتا نہ ہے۔ بیماری نے میرے عذاب چھین لئے ہیں۔ اب میں اتنی ہی ہوں جتنی نظر آتی ہوں۔ ECG کی رپورٹ جتنی۔ چند روز پہلے مجھے احساس ہوا کہ میں تو دہلیز سے بھی زیادہ ڈر نے قدم رکھنے لگی ہوں چنانچہ کچھ گھٹیے قسم کے شاعروں اور نقادوں کے ہاں پہنچی اور ان کے اصل میں اتری۔ تعلیم یافتہ گالیاں دیں۔ بہت دنوں سے سنتی آرہی ہوں۔ سارا ہے مجھے عشق کرتی ہے۔ "سارا بہت آسان ہے" سارا تو میرے ساتھ سو چکی ہے اگر میرے کسی کے ساتھ ایسے تعلقات نہ ہوں تو کم از کم میں اتنی سچی ضرور ہوں کہ بتا دیتی ہوں کہ صاحب آگ ان چیزوں میں لگی ہے۔ ارادہ ایک ہاتھ کا ہوتا ہے دوسرا ہاتھ تو نقلی ہوتا ہے۔ اب پتہ چلا سنگِ میل کندہ کیوں ہے!! پتّھر بھی اکیلا نہیں رہنا چاہتا۔ صبر کی پٹاری میں سانپ کو بھوکا رکھنا زہر کو حاملہ کرنا ہے!....

والسّلام

سارا

سلیم!

چاروں طرف آوازوں کی دہلیزیں ہیں۔ در کہاں سے شروع کروں۔ یہ آوازیں سنو۔

سارا مجھ سے عشق کرتی ہے سارا نے مجھے ایسے دیکھا تھا۔ سارا ہمارے ساتھ قہقہے لگاتی رہی ہے!! کیا کہیے؟ حالانکہ کسی سے میرا کوئی ایسا تعلق نہیں اگر

ہونا تو ضرور لکھتی کیونکہ میں اتنا سچ تو بول ہی سکتی ہوں ؟ . . .

اور ایک روز ناہموار استاد نے کہا "لڑکی سنبھل کر چلو زمانہ خراب ہے اپنے بدن میں تمیز پیدا کرو" ناہموار کو شاید خبر نہ تھی اس کی لڑکی کب خراب ہے دنیا ہے دُنیا۔ ایک اور نے کہا "اکیلی عورت کو یہ سوسائٹی قبول نہیں کرتی لہٰذا اکیلی عورت میرے گھر مت آیا کرو۔" دیکھو! انسان کہاں تک اکیلا . . ہے۔ یہ سوسائٹی ہے ؟ کتنے مہذّب اور کتنے جفاکش ہیں لوگ۔ ایمان سے زیادہ ان کو عزّت پیاری ہے، حالانکہ جاننے تک نہیں کہ عزّت ہے کیا چیز.... عزّت کے اعضاء کون سے ہیں۔؟؟

میں تو لعنت بھیجتی ہوں ایسے بیس پچیس افراد پر جو سوسائٹی کہلاتے ہیں اور ازار بند سے سوسائٹی ناپتے ہیں۔ یہ آنکھوں کے عزّت دار، کتیا کا دودھ پیتے ہیں۔ یہ پلے، کتّورے اپنی ماؤں کو کہاں کہاں سے دیکھتے ہیں۔ میں نے پورے برصغیر کا اکیلے سفر کیا ہے۔ میں نے اس جسم کا کیا کیا نہ دیکھا ہوگا۔ یہ لوگ ناف سے شروع کرنے میں دیکھنا اور پھر دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ یہ سکتے سے کب چونکیں گے ؟ سوسائٹی کے خواجہ سرا میری ایک رات بھی تو نہیں چرا سکتے۔ پھر میں انہیں کیسے بتاؤں، سُہاگن کسے کہتے ہیں !!!

"مینوں انج چھیڑ دے نیں، جیویں میں سچی مچی وچھڑ گئی ہوواں"

طبیعت خراب ہے۔ اب تو یہ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہ گئی شاید۔ تم تو مجھ سے بھی زیادہ سچے ہو! تم اگر میرا اتنا حوصلہ نہ بڑھاتے تو شاید میں سچ سے ڈر جاتی، لیکن تم نے میری خود نوشت سنی اور مجھے ایک انسان جانا جس کے پاس تم جیسا دوست ہو وہ اپنی آنکھیں مسمار کر سکتا ہے۔ فہ تمہارا زمین کے بعد بھی ہے پھر ایک صدی تمہارا مکالمہ نہ سمجھے تو کوئی بات نہیں۔ تمہارے گھر تو صدیاں پڑی ہیں باقی رہی صورتِ دیگر تو تم سے بہت لوگ پیار کرتے ہیں۔ امرتا کے بعد میں بھی تو تمہاری ہی ہوں پھر آنسوؤں کو تھوک دو اور آنکھ سے دکھ میں شامل

ہو جاؤ۔ وقت بہت کم رہ گیا۔ گھڑیاں خاموش پڑی ہیں۔ تم اداس نہ رہا کرو۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے لیکن ؟

ساراؔ

احمد سلیم :

مذاق شروع ہوتا ہے تو ساری بات ختم ہو جاتی ہے۔ زمین میری تھکن سے بھی چھوٹی لگ رہی ہے۔ جن کو میں نے اپنی زمین سے سینچا تھا وہ ہمیشہ مجھے غلیظ مٹی سمجھ کر اپنی اپنی کیاریوں میں ڈالتے رہے۔ میرے لکھنے کے لئے کائنات کا کورا کاغذ چھوٹا ہے ادھورا ہے۔ ان کی آنکھوں سے کورے کاغذ گرنے لگتے ہیں ویسے تو میں بہت مال دار مشہور ہوں اور یہی میرے صبر کی لگام ہے۔ لگام سفر سے زیادہ ہے سو بے ارادہ ہے۔ جانتے ہو میں نے ایک قیاس لکھا ہے ۔

"خانہ بدوش خیمے لگاتے ہیں جس جگہ

اے کاش اس زمین پہ ہوتا ہمارا گھر"

میں نے اپنے منہ سے صرف اتنا کہا تھا میری آواز اپنے ہاتھ رکھو! ٹھیک ہے اور بہت خوبصورت ہے یہ سنگ مرمر کا پھول۔ ہوائیں جنگل سے یہ پھول اڑا لائی ہیں اور بت وہیں چھوڑ آئی ہیں ۔

سنگ مرمر کے پھولوں میں

مُردہ آنکھیں، زندہ ہاتھ

میں بہت ہنسنا چاہتی ہوں اور شاید مسکرانا بھی چاہتی ہوں۔ لیکن پھر شاید میرے ہونٹ جھوٹے ہو جائیں۔

کافی غور سے دیکھتے ہوئے ہیں مجھے یہ میری ماں کے رحم سے گرے ہوئے ....

میں تو اسی وقت ڈر گئی تھی جب میرا باپ میری ماں کے ساتھ قہقہہ لگانے میں مصروف تھا۔ سارے قدم رخصت ہو گئے ہیں اور ساری آنکھیں جھنجھنا رہی

ہیں۔ اپنی آواز اپنے بدن سے توڑتی ہوں اور پھر سنتی ہوں۔ میں کتنے گاؤں سے
بنی تھی۔ اب تو آنکھوں کو پسینے آ رہے ہیں۔ مجھے پتھر مارنے والوں پر لازم نہیں
وہ ایک آنکھ سے دیکھتے ہوں کوئی بھی کسی وقت بھی میرے اندر خوف کے کنویں
کھود جاتا ہے اور میرے جذبوں کا گلدستہ کسی بھی اور بہت سارے چہروں پر سج
جاتا ہے آنکھوں کی سجاوٹ ان کے ضمیر قائم کرتی ہے اور پھر یہ باری باری
میرے بس آتے ہیں اور میں بہل سی جاتی ہوں واقعی سلیم بہل جاتی ہوں
ان کو دیکھ کر مجھے اپنی پتنیاں یاد آجاتی ہیں ایسے لوگ کہاں ہیں جو میرے
ساتھ جنگل سے آئے تھے۔ ان سے تو چہرہ چھڑانا پڑتا ہے اور بار بار اپنے لبوں
کو بھول جاتی ہوں جیسے یہ کبھی بھی تھکے نہ ہوں۔

یہ ہونٹ میرے گداگر ہیں اور بدن کے فالتو ترازو ہیں جل آنکھوں کی
زنجیر سے بندھا بھونکتا ہے اور میں چوہڑ بچہ بنتی ہوں۔ میرے گھر کبھی چور نہیں
آیا۔ آنکھیں بانٹنے کے باوجود کتنی تاریک ہوں۔ تو اخلاقی طور پر میرے ہونٹ
سہلینہ سے جھوٹے ہیں سو یہ بھی اکیلے مجھے کبھی نہیں ملتے۔ فاصلے والے کے پاس
میرا کوئی اعتراف نہ تھا سو ایک تنہائی ضمیر میرا فالتو ہے۔ میدان سپہ سالار
کی کوشش جیتتا ہے۔ لہو کی ٹھیکری میرے بال نوچتی ہے اور میرے کھیل بگاڑتی
ہے سلیم! سناٹے کی زبان واعظ ہوں اور یہ شور مچانے لگتے ہیں اور چھاؤں
سے سورج اڑ جاتا ہے۔ میرا آخری قیام ہے اور لوگ راز داری میں مصروف
ہیں۔ حالانکہ میرے بدن کا چاک کوئی در نہیں داغ سکا۔ میں مکمل طور پر
ہنس چکی ہوں اور زبان کے علم سے بچھڑ چکی ہوں۔ چراغ آگ کی زبان
درازی سے جنم لیتا ہے اور اشرف المخلوق سے زیادہ مکالمہ رکھتا ہے کانٹے
کے ایک لباس سے کتنے پھول مرتے ہیں جیسے حرف آنکھ کھودتے ہیں۔ وہ چائے
کی پیالی آج تک حلق میں نہیں انڈیل سکی جو مردہ دودھ سے بنائی گئی تھی
پیاس کے کانٹے ہیں کہ میری آنکھیں بنائی گئی تھیں اور نہریں مردہ کر دی گئی تھیں

میرا جسم ایک پیڑ کی طرح تراش دیا گیا اور مجھے سفر کا ساحل کہا گیا۔ ساحل پر کوئی گھر نہیں بناتا یہ صرف سمندر کا مذاق ہوتا ہے۔ صبح و شام میرے بدن سے پرندے اڑتے اور رات بھر میری اداسی میں سوتے۔ زمین میرے کئی انسان چاٹ چکی ہے لیکن مجھے روز بھوک لگتی ہے اور ہر انسان روز بھوکا ہوتا ہے میری ہری شاخوں سے گرتے پتے زرد تھے اور زمین کا مذہب تھے۔ دنیا ہر ایک فرد کے بعد تیسری ہوتی ہے اور دوسرا فرد غائب ہو جاتا ہے۔

سلیم! غیب کے کنویں میں رسی بھونکتی ہے اور میرے انگارے سے آگ بندھی ہے پانیوں میں بل ڈالنے کے بعد رسی زمین پر رہن رکھ دی جاتی تھی اور پھر پیاس مجھے چکھتی ہے اور پھر میں پیاس چکھنے کی عادی ہو جاتی ہوں مجھے دیکھنے سے پہلے یہ سارے لوگ شفاف تھے۔ پھر میں نے ان کا ضمیر گوندھا اور نمک سے کہا چکھ۔ آگ کی تلاش میں میرے کئی چراغ مجھ سے بچھڑ گئے۔ جن کی یاد مجھے سیاہ کرتی ہے اور خاموشی میرا ڈھنڈورا پیٹتی ہے۔ چلی گئی میرے برتنوں میں رہنے والی سمجھتی ہے جیسے میں نے کبھی بچے نہیں کھلائے.... سارے پیاسے سود دیتے پر تیار ہیں۔ لیکن پانیوں کا سود صرف مٹی ہوتی ہے۔ میری کمین گاہ سے کلنکنی بھاگ گئی تھی بس اکیلی رہ گئی۔ میں نے آگ کے لئے بُرادہ اکٹھا کیا تھا لوگوں نے میرا ضمیر سمجھ لیا۔ ہر گندے نالے کا ایک بہاؤ ضرور ہوتا ہے۔ اگر ہم نے گھر سے کوڑا اکٹھا کیا ہو۔

سلیم! لگتا ہے خدا تنہا ہی ہوتا ہے اور تنہائی شیطان شکار کرتی ہے۔ چلی گئی اور اپنا رزق چھوڑ گئی، شیطان ہمیشہ اکیلا ہوتا ہے کہاں! فاصلہ اٹھائے آنکھوں کی کوکھ سے نپٹ گیا۔ کتا.... اپنے دانتوں سے کاٹتا ہذیان بکتا مجھے بھونک گیا۔ دوست! میں صرف مثال ہوں اور کہیں نہیں.... یاد کرنے کی عادت پڑ گئی ہے اب یہاں کوئی چیز ڈھونڈنے کے لائق نہیں رہ گئی۔ طے شدہ انسان کے

پاس تلاش کی میعاد کم ہے اور فضول ہے ۔ وفاداری اور گلیوں میں کتنا کم اور
کتنا زیادہ مشہور ہے ۔ سو مالکوں کو میں اپنے فٹ پاتھ کا نمبر لکھ دوں ۔

میرے معاوضے میں میری کمینگی ضرور رکھنا مجھے اکیلے میں خوف آتا ہے اور
میرے مکمر کے پتھروں سے جتنے زخمی ہیں انہیں دریافت کرو ۔

مجھے اپنے حال سے آگاہ کرو کہ میرے تمام سوچ انکاری ہونے لگتا ہے
ہاتھ کی پیدائش درست کرو اور اپنے انگ سے دھمال کھیلو اور میرے قصور
دریافت کرو کہ میں دیواروں کی طرح بانجھ رہی ہوں اور منڈیروں سے پرندے
اڑاتی رہی ہوں ۔ مجھے میرے بچوں کے قصور لکھو کہ میں اس سے زیادہ پیاسی
نہیں ہوں ۔ میرے گھر کی سلاخوں سے کتنے کتّوں کی زنجیریں بنتی ہیں شمار کرو
اور یقین کرو میں اپنی ملاقات میں تمہیں شامل نہیں کروں گی اور تمہارا رزق
نہیں ہوں گی کہ میں انسان کی پہلی غلطی ہمیشہ معاف کر دیتی ہوں اور انسان
دوسری غلطی پھر کبھی نہیں کر سکا اور پھر خدا کو تیسری بار دھراتی ہوں صرف
ایک بار ۔ کھلونے کا مقدر زیادہ ٹوٹنا ہے اور [illegible] کا مقدر زیادہ سے زیادہ
غضب ہے ! نہ میں نے کسی کو جنا نہ کسی نے مجھے جنا ۔ اکیلی ہوں اور زیادہ
لکھتی ہوں سیاہی اور جگاتی ہوں رات ۔

سلیم ! ہمارے پالنے کا اچھا اور بڑا کھلونا کون سا ہے سلیم ! میں تمہیں
گانا چاہتی ہوں لیکن افسوس تم بالکل میرے جیسے ہو اکیلے ۔ سارا بھی اکیلی ہے
ایک جنم جلی کی طرح ۔ خاموشی کو سارے نام رٹنا آ گئے ۔ یہ سناٹا ایک نئی قید
کی پیروی کرے گا اور شاید ہمارے لب پھر جھوٹے نہ ہوں ۔

تمہاری تو بیکی دشمن
سارا شگفتہ

۲۴-۹-۱۹۸۱

احمد سلیم!

پہلاں تے شکریہ قبول کرو کہ تسی میرا اڈا اچھا انٹرویو شائع کیتا۔ ایہو جیا انٹرویو تے سوہنی تحریر تسی ای لکھ سکدے ساؤ۔ اللہ تہاڈے قلم نوں ہور عروج دیوے، تہاڈے نال ملن دا بہت دل چاؤندا سی ایسے واسطے میں سنہیا دِتا سی کہ چلو ایس بہانے ملاقات ہو جائے گی

امرتا پریتم جی دا کافی دناں توں کوئی خط نئیں آیا میں دو مہینے بالکل منجی نال لگ گئی۔ ایس واسطے کدرے وی نیئں گئی میں تہاڈا بڑا احترام کردی آں۔ فیر پندرہ دن ہسپتال وچ داخل رہی۔ ہُن نے کہندیاں شرم آؤندی اے... سلیم! دل نئیں لگدا۔ ہنی سمندر گود وچ رکھ کے روندی اے۔ میں رب دی حبیب نوں ٹٹیا ہویا کھڈونڑاں واں۔ ہُن تے میں کسے نال نئیں مل دی۔ لیٹرے گئے نیں۔ میں ایس دنیا وچ اک منٹ نئیں رہنا چاہندی۔ سب کجھ گواچ گیا اے سلیم۔ میرے ہاسے، میرے اتھرو، میرے مکّر، میرے چہرے۔ انسان لبھدیاں لبھدیاں میرے تے ہتھ کالے پے گئے ہیں۔ سچائیاں دے منہ وچ میں اپنی جیبھ رکھ دتی اے تے لوکی نفرت دے پھل چگن لگ پئے نے۔

شنازیہ آئی ہوئی اے تے اونوں میرا اسلام پیار کہہ دیناں۔ بڑی ہی ذہین کڑی اے طبیعت ٹھیک ہوئی ہے میں ضرور آواں گی۔ میں کارہی ہوندی آں نے کار واے کہہ دیندے۔ سارا کا کوئی گھر نئیں کیونکہ انشا و شاعراں کولوں بڑی نفرت کردے نیں۔ جی تے چاہندا اے ایس کار نہ رہواں پر بڑی دی وجہ توں کلی نئیں رہ سکدی۔ بس اپنے اپنے بس دی یا اپنے اپنے روگ دی گل اے۔ جہل نال لڑنا بڑا اوکھا ہوندا اے۔ امید اے تسی برا نئیں مناؤ گے۔ سارا دا نے کوئی کار نئیں۔ امرتا جی نال ملن نوں بڑا دل کردا اے۔

والسلام
سارا شگفتہ

احمد سلیم!

آج میری امّی نے مجھے ایسے دیکھا جیسے دو دیواریں بھی نہ دیکھتی ہوں اور
کہا ، ر بھائیوں کے سامنے لڑکوں کے ساتھ پھرتی ہو۔" جی چاہا ۔ ۔ ۔ ماں کے پستانوں
سے تک نچوڑ ڈالوں لیکن وہ میرے لہو کے راز نبھاتی رہی ۔ زندگی ہے ۔؟
ماں کے بدن سے بھی میرا جھولا بچھڑ گیا ہے اور سلیم! آج فون پر تم نے
کچھ کہا تو مجھے اچھا لگا اور میں نے پہلی بار سوچا ساراآب واقعی گندے لوگوں
سے ملاقات نہیں کرے گی ۔ ویسے بھی مجھے بستیوں سے خوف آتا ہے ایک بات کہنی
ہے! جس نہر سے مٹی حاملہ ہوا سے نہر نہیں پیاس کہتے ہیں جب ہم ایک ڈرائنگ
روم میں جاتے ہیں تو لگتا ہے میں اور تم آٹومیٹک کھلونے ہیں ۔ میں روپے کی
زمین ڈھونڈ لیتی ہوں ۔ اور یہی میرا دکھ ہے ۔ زندگی اتنی بیت چکی ہے کہ قبر کو
سر اٹھانے کی ضرورت نہیں مٹی سے تو میدان کی مثال نہیں ملتی ہے اور مٹی میں ہی
ہمیں روٹھنا ہے تو کیوں نہ پیڑ میں چھاؤں پیدا کریں ؟۔
جیزیں کیت تک دور رہیں گی آخر ہمیں جیزوں میں ٹوٹنا بھی تو ہے! ایک
آنکھ میری ماں ہے تو دوسری آنکھ میری کنجری ہے!! معجزے ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں
کے ہاں ۔ کیا تمہیں میرے کفر پر اعتبار نہیں ہے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میرے سامنے
کوئی تمہاری توہین کرے اور تمہارے خلوص کو معجزے کے سوا کوئی تحکم نہ بخشے ۔
تم نے کیا خالی آنکھیں کبھی نہیں پڑھیں ؟ میں تمہارے لفظ کے احترام میں تمہاری
برائی سنتی ہوں میں جوئے کے بغیر ہار جیت کی قائل ہوں لیکن تمہارا بہت احترام
کرتی ہوں ۔ اگر تم مجھ سے کہو کہ سارا تمہیں تنہائیوں کے لئے ٹھیکری بننا ہے تو میرے
لفظ گواہ ہیں میں کبھی انکار نہیں کرونگی لیکن اگر کوئی میرے سامنے تمہیں
اپنا حوالہ بنائے تو یقین کرو مجھے ایسا لگتا ہے " جیسے میرے زخم سے کوئی میرا بچہ
نوچ رہا ہو" میرا تعلق ایسا ہی ہوتا ہے ورنہ نہیں ۔ تمہیں بہت دکھ ہوگا ۔ لیکن
جنم کے وقت ماں کو بچے کا نہیں اپنا دکھ ہوتا ہے اور مٹی سمندر سے کب بچھڑتی ہے

ہمارا دلیس کوئی اور ہے۔ آنکھ سے بلندی بلندی بے معنی ہے تاہم بھوک
نبھانے والے لوگ اداؤں سے شاید بڑے ہوتے ہیں۔
میں جانتی ہوں تمہارے کھلونے ٹوٹ جائیں گے اسی لئے تمہیں کھیل سے
منع نہیں کر رہی لیکن کوئی موجود ہو تو انسان لبیک کہتا ہے نا۔ زبان پر انگار
کا ذائقہ رہنا چاہیئے۔
بتاؤ! کوئی کسی کو گوٹ سمجھے تو زیادہ سے زیادہ کتنا بڑا کھیل کھیل سکتا
ہے؟ گوٹ جننا۔ کیونکہ میں اپنی ہڈیوں سے ملامت چنتی رہتی ہوں، تو دوست
کے دکھ سے میری ہڈیوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ قلندری میرا مذہب ہے اور ...
فٹ پاتھ میرا گھر ہے۔ فون کی گھنٹی سے زیادہ میرا دل دھڑکتا ہے۔ ستار کی
انگلیوں سے زیادہ میری آنکھوں میں ساز ہیں۔ میرے دوستوں کے حوصلے ہیں
میرے آنگن سے سورج اترتا ہے۔ پھر کون لکھ سکتا ہے تیرے تلوے پر ... کانٹا
کاش آنکھیں دو اور ہوتیں تو ہم بھی دنیا کے جوتے میں شریک ہوتے۔ لیکن
نہیں ہو سکتا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں پر امرتا پریتم لکھا ہے تمہیں تمہاری امرتا
پریتم نہیں ملتی۔ مجھے میرا امروز نہیں ملتا۔ ہمارے گھر کی چار سمتیں ہیں اگر تم زیادہ
ضد کرو گے تو میں تمہارے ہاتھ پر کوئلہ رکھ دوں گی اور کہوں گی نام لکھو...
تمہاری تو ہی دشمن

سارا بنام امرتا

امرتا! میں فٹ پاتھ پر چل رہی تھی کہ کسی آواز نے میری پیٹھ پر ڈنک مارا۔ 'بی بی جی! چار آٹھ آنے...... بی بی جی! صرف چار آٹھ آنے....
میں نے پلٹ کر دیکھا تو دس دس سال کی چار بچیاں، اور ان کی گود میں ایک ایک ننگا بچہ۔ تم تو جانتی ہو، تیز دھوپ کی نظر کم ہوتی ہے۔ میں نے موت کے بارے میں بہت سی کتابیں پڑھیں لیکن کوئی بات نہیں بن رہی تھی اور آج میں نے ان بچیوں کی آنکھوں میں ایسی موت دیکھی جو قبرستانوں میں بھی نہیں ہوتی۔

میں دھوپ کی ہڈیاں چننے لگی۔

پھٹے ہوئے کپڑوں پر جمے ہوئے میل کی کئی شکلیں بن رہی تھیں انکے دلوں میں اٹھنی دھڑک رہی تھی میرے پاس پیسے نہیں تھے پھر بھی میں انہیں، انہیں کی طرح دیکھنے لگی۔ ان بچوں کی سارے دن کی کمائی یا تو اٹھنی ہوتی ہے یا ٹھوکر۔

امرتا! آخر غریبوں کے گھروں میں گندم کیوں نہیں اُگتی۔ جی چاہتا تھا ان بچیوں سے ڈھیر ساری باتیں کروں۔ لیکن شاید میں ساری باتیں جانتی تھی......

ہاتھ پھیلانے کا زخم تو میں نے ان کی ہتھیلیوں پر دیکھ لیا تھا۔ میں نے اپنی خاموش آواز میں کہا "تم ان چاروں بچیوں سے زیادہ کام چور ہو کہ اٹھنی تمہیں اتنی وزنی محسوس ہو رہی ہے۔

دُنیا کے یہ تمام بچے، شرارتیں نہیں کرتے، اٹھنی مانگتے ہیں۔
کیا فٹ پاتھ نے انسان سے زیادہ بچے پیدا کرنے شروع کر دئیے ہیں؟
ہاں امرتا! بچے اکثر کھو جاتے ہیں لیکن جو بچے فٹ پاتھ پر پڑے ہیں انہیں ڈھونڈنے والا کوئی نہیں .... میں ماں سے لے کر زمین تک بہت روئی۔
اپنے لہو سے کورے کاغذ جلاتی رہی ہوں؛......
کہیں پھولوں پر سورج کا لہو نہ رہ جائے ....
کاش زمین پر جبر کا خاتمہ ہو جائے ......
اپنی چادر میں، میں روز مری ہوئی آوازیں ٹٹکتی رہتی ہوں میرا اپنا اندھا بدن نہ جانے کیسی کیسی ٹھوکروں میں ہے......
گھڑیوں کے دل ہمیں پکارتے ہیں لیکن گھڑی تک پہنچتے پہنچتے وقت بدل جاتا ہے۔

امرتا! دشمنوں نے میرے بچوں کے دلوں میں عزت کا بیج بو دیا ہے۔ ایک دن میں نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں نفرت دیکھی تھی لیکن مجھے یقین نہیں آیا۔ کیا میرا بیٹا بڑا ہو کر مجھ سے نفرت کرے گا۔؟ میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گی۔ کیا میرے بچوں کا لگان، میرے بچوں کو بھی دینا پڑے گا؟ جن کے لیے میری آنکھوں میں آنسو نہیں، ہاتھوں میں کوئی دعا نہیں، کیا وہ مجھ سے اس قدر بچھڑ چکے ہیں؟
ہاں امرتا! روایات اور سماج کا زہر وہ "عزت" کے پیالے میں پینے لگے ہیں۔ "عزت" کے بین تو میں بھی بچپن سے سنتی آئی ہوں۔ کاش میرے بچے میرے پاس ہوتے تو میں انہیں سچائی کے انگاروں کے ساتھ رہنا سکھاتی۔ جب کبھی میں ان سے ملنے جاتی ہوں لگتا ہے جیسے ان کے دل ماں کی قبر جیسے ہو گئے ہوں پہلا خوف، جو اُن کے دلوں میں ڈالا گیا۔ تمہاری ماں غیر مردوں سے ملتی ہے۔ سگریٹ پیتی ہے۔ دوسرا خوف جو ان کی عمروں سے بڑا ہے ابھی میرے بچوں کا قد میرے گریبان سے چھوٹا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت مجھے ترتیب دے

گا، زمانے کی اکائیاں بڑھتی ہی جائیں گی۔ امرتا! میں بچوں کے لیے آنکھوں سے زیادہ تڑپتی ہوں۔ اگر بچوں نے بڑے ہوکر "ماں" کے علاوہ کوئی لفظ کہا تو سارا تو اپنی قبر میں بھی نہیں اتر سکے گی۔ انسانوں کے داغ دھوتے دھوتے، میرے تو ہاتھ کالے پڑ گئے ہیں امرتا!

میں ضمیر سے زیادہ جاگ پڑی ہوں۔ خاموشی میرا دل ہے لیکن میں سمندر سے زیادہ شور مچانا چاہتی ہوں۔

میں ننگے سورج سے زیادہ خوبصورت ہوں لیکن سیاہ پوش کبھی کبھی ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے تو نہ جانے کیا کچھ بولنے لگتی ہوں۔ پچھلے دنوں پھر دو الیکٹرک شاک لگے تو طبیعت کچھ سنبھلی۔ اس سے تو موت بہتر ہے۔ لیکن ... اپنے شکار کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑتا۔ میں خدا کی زبان سے ٹوٹا ہوا ایک ٹکڑا ہوں۔

دو دن سے مسلسل لکھ رہی ہوں۔ میرے کمرے میں کافی ردی جمع ہو گئی ہے۔ میری بہن نے ردی اکٹھی کی اور باہر پھینکنے لگی کہ اتنے میں امی آ گئی۔ بہن سے کہنے لگی۔ کاغذ باہر پھینک کر محلے میں ہماری عزت خراب کرتی ہو؟ انہیں جلا دو۔ ہاں امرتا! میرے کمرے میں سے جتنی ردی نکلتی ہے۔ اسے امی جلا دیتی ہے کہتی ہے کہتی ہے" ننگے اور بیہودہ لفظ مت لکھا کر" اور پھر میں لفظ سے زیادہ خاموش رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔

یہ میں کس دنیا میں آ گئی امرتا! بیٹیا دیکھے تو نفرت سے۔ اور ماں، میرے الاؤ پر آگ کو بین کرنے کے لیے ڈال دیتی ہے۔ بھائی کہتے ہیں، یہ پاگل ہے ورنہ ہوش میں کوئی انسان اتنا لکھ سکتا ہے؟ گھر والوں کو اور اس نام نہاد سماج کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں اپنا گھر نہیں بساتی۔ لیکن میں یہ کہتی ہوں امّی جان! روٹیاں تو ہزاروں عورتیں پکا رہی ہیں۔ اور پھر وہ اپنے ہی جہنم میں واصل ہو جاتی ہیں۔ مجھے گندم سے زیادہ انسان کی تلاش ہے۔

زیادہ دور کیوں جاؤں؟ میری ماں کے شوہر نے دو شادیاں کیں۔ اور میری

ماں نے ساٹھ سال رو کر گزار دیئے۔ یہ تعلق کی کون سی قسم ہے کہ عورت اور مرد، جبر کے عالم میں ستر سال گزار دیں حالانکہ اسلام میں ہے کہ اگر مومن کے دل میں کینہ ہے تو ہر تعلق حرام ہے۔ اور ایک حدیث ہے۔ جبر کے ماحول میں پرندے بھی اپنے گھونسلوں میں دم توڑ دیتے ہیں،

امرتا! میں جھوٹے تعلق کو نہیں مانتی۔ سورج، دن کو جنم دیتا ہے۔ میں انسان کو جنم دیتی ہوں۔

امرتا! کوئی مندر، کوئی مسجد، کوئی کلیسا ایسا نہیں جہاں میں اپنے کپڑوں سے نفرتیں دھو سکوں۔

میں کمرے میں اپنی آواز بھول گئی ہوں، میرے بدن پر پرندے کبھی نہیں چہکے۔ میری سانسوں میں سورج ڈوب رہا ہے...... میں آنکھوں میں چُن دی گئی ہوں۔

امرتا! یہاں میں کسی سے نہیں ملتی۔ احمد سلیم سے بھی کبھی کبھار ملاقات ہوتی ہے۔ بہت لوگ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں لیکن میں خود ملنا نہیں چاہتی۔ یہ جھوٹ کے اوزان سے مجھے تولنا چاہتے ہیں

میں اکیلی گھومتی رہتی ہوں۔ طبیعت اداس ہو تو سمندر کے کنارے جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ اور پھر سمندر سے باتیں کرتی رہتی ہوں۔ خاندان کی لڑکیوں تک کو مجھ سے دور رہنے کی تاکید کی جاتی ہے کہ کہیں یہ بھی لکھنے نہ لگیں۔ دیکھ امرتا! کتنی تنہائی ہے.... کبھی کبھی آسمان کو دیکھ کر پہروں روتی رہتی ہوں۔ بدن کی قید سے آزاد ہوں! اور روح کس نے دیکھی ہے۔

وقت بہت کم رہ گیا ہے امرتا! میں چلی جاؤں گی۔ بدن کے حصار میں زیادہ دیر تک قید رہنے سے روح کو زنگ لگ جاتا ہے امرتا!

میرے بچے ایک دن تیرے پاس آئیں گے۔ ان سے کہنا، تمہاری ماں، خدا سے زیادہ، تم سے محبت کرتی تھی۔ کیونکہ اس نے خدا سے خاموشی سیکھ لی تھی۔

امرتا! میں جب بھی کوئی پودا لگاتی ہوں۔ مٹی قبر کی طرح اپنا منہ کھول دیتی ہے۔ اور موت تو روزانہ میرے دل میں آکر دھڑکتی ہے۔ میں دلداروں سے اُکھڑ اُکھڑ کر

بگر رہی ہوں۔
امرتا! میں تجھ سے دُکھ سہنا سیکھ رہی ہوں ورنہ میں تو ہاتھوں سے گری ہوئی دعا ہوں۔ ....

جنوری 83ء

امرتا!
جب میں پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ میں نے ڈانس مقابلے میں حصّہ لیا تھا ایک ہنگھٹ بنایا گیا تھا۔ ایک رسی اور ایک لڑکی لڑکا بنی تھی گیت کے بول تھے
لڑکا :۔ پیاسے کو پانی پلا پیّو رے گوری تو راہی مسافر جائے۔
لڑکی :۔ بھر پیو چھیلا ہاں بھر پیو چھیلا کاہے کو روگ لگائے۔
میں پندرہ اسکولوں کے مقابلے میں اوّل آئی تھی۔ پھر کبھی اتنی خوش نہیں ہوئی۔ آج کل! جب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری طبیعت خراب ہونے والی ہے کمرہ بند کرتی ہوں۔ میوزک لگاتی ہوں اور خوب ڈانس کرتی ہوں اور پھر اکثر سو جاتی ہوں۔
پچھلے دنوں ڈاکٹر نے امّی سے کہا اب کوئی دوا اثر نہیں کر رہی۔ اب مارفیا کا انجکشن لگا کرے گا۔ میں نے انکار کر دیا ہے میں خود کوشش کر رہی ہوں کہ ٹھیک ہو جاؤں۔ کافی حد تک ٹھیک ہی ہوں۔
ہونہہ۔ یہ ڈگری یافتہ یا ضمیر میرا کیا علاج کریں گے۔
تمہاری سارا شگفتہ
۳-۱--۱۹۸۲

امرتا!
روز تمہیں تنگ کرتے آجاتی ہوں لیکن پھر جاؤں کہاں ؟
یہ تو میں نے تمہیں لکھا ہی نہیں کہ میں نے شاعری کیسے شروع کی۔ ؟

رات سوئی۔ آوازیں ٹھہریں تو سوچا آج زمین سے باتیں ہو جائیں۔ احمد سلیم
کو نظم نے لکھا ہے کہ سارا کی نظمیں رُلا دیتی ہیں سلیم اور تم سے آنسوؤں کی
اُمید نہ رکھوں تو پھر کون ہے میرے موسم دیکھنے والا۔ ہونہہ! ہمارے
آنسوؤں سے آنکھیں بنائی گئیں۔
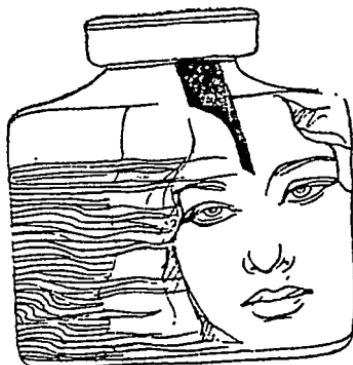
بخدمت جناب ایس پی صاحب!
عزّت مآب!

گزارش ہے آج سے آٹھ ماہ پہلے میری شادی محمد اشرف سے ہوئی۔ چند روز بعد میرا خاوند مجھے غلط راہ پر اکساتا رہا۔ اکثر مجھے مارتا پیٹتا رہتا۔ اور میں گھناؤنے عذاب سہتی رہی۔

میں ایک غریب شریف خاندان کی بیٹی ہوں۔ برصغیر کی ایک ادبی شاعرہ، ادیبہ ہوں۔ میں کوئی غلط حرکت نہیں کرسکتی تھی۔ چونکہ میں نے علم بھوک کے سائے میں حاصل کیا ہے۔

میرے والدین نہیں ہیں۔ میرا واحد سہارا میرا قلم ہے۔ اس کے ذہنی، جسمانی ہتک کے عذابوں کی وجہ سے شادی کے ایک ماہ بعد میں نے کہا "مجھے طلاق دے دو۔ میں تمہارے ظلم برداشت نہیں کرسکتی۔ ان آٹھ ماہ میں وہ مجھے بار بار گھر لے جاتا اور مارتا پیٹتا رہتا۔ میں برداشت کرتی رہی۔ ایک روز مجھے اپنے گھر بلا کر لے کہا آؤ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ پہلے تو مجھے بہت مارا کہ میرے جسم پر نیل ڈال دیئے میں آدھ جاں ہوگئی۔ اچانک پھر چھری سے مجھ پر حملہ کیا۔ پہلے میرے سینے پر وار کیا میں بچ گئی۔ آخرکار چھری میری بائیں پنڈلی پر لگی۔ میری چیخ و پکار سن کر مالکِ مکان اور ایک اس کا ہمراہی جسے میں نہیں جانتی۔

ان دونوں نے اُسے پکڑا وہ بار بار یہی کہتا رہا۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔ یہ کیسے میرا کہنا نہیں مانتی۔ مالک مکان کی وجہ سے میں قتل ہونے سے بچ گئی۔

میں تھانہ شاہ فیصل کالونی نمبر۲ پہنچی رپورٹ درج کرائی۔ رپورٹ کی نقل میرے پاس محفوظ ہے۔ میں نے جناح ہسپتال کی میڈیکل رپورٹ بھی درج کرائی۔

اس وقت وہ عبوری ضمانت پر باہر ہے۔ پرسوں صبح ایک بدمعاش کو جو کہ سکوٹر پر سوار تھا میرے گھر کے دروازے پر۔ وہ بدمعاش کہتا ہے کہ چلو میرے ساتھ تمہیں اشرف بُلا رہا ہے۔ ورنہ ہم بدمعاش ہیں۔ ہم تمہیں زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے۔ میں نے اس کو گالیاں نکالیں۔ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ شور مچا کر پورا محلہ اکٹھا کر لوں گی اور تمہیں پٹواؤں گی۔ جب میں نے محلے کا نام لیا تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا۔ اور یہ کہہ گیا کہ میں پھر آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔

کل صبح جناح ہسپتال سے آ رہی تھی کہ اشرف کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے اسکوٹر پر۔ اشرف کہنے لگا۔ میں بہت جلد تمہارے پاس پہنچوں گا۔ اپنی زندگی کے دن گنتی رہنا۔ میں دیکھوں گا قانون اور اخبارات کہاں تک تمہارا ساتھ دیتے ہیں۔ عنقریب تمہارے اخبارات میں آ جائے گا۔ کہ مشہور شاعرہ، ادیبہ، سارا شگفتہ قتل ہو گئی۔ اس سے پہلے قانون نے اور تم نے میرا کیا بگاڑ لیا ہے۔ میں اب تک باہر ہوں۔ میرے پاس دولت ہے۔ قانون کے محافظوں کو دولت دے کر خاموش کر لیتا ہوں اور کر لیا ہے۔ اب تمہارا کام تمام کر دوں گا۔

"برائے کرم میری جان اور عزت کی حفاظت کی جائے" کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ یہ کسی وقت کسی ٹائم مجھے قتل کر دے۔

میں بے سہارا ہوں ماں باپ کے انتقال کے بعد بالکل تنہا۔ چند نظمیں اور کالم لکھکر دو ٹائم عزت کی روٹی کھا لیتی ہوں۔ میرے پاس علم ہے دولت نہیں کہ اس جیسے بدمعاشوں کو خرید سکوں

"آپ سے میری دردمندانہ اپیل ہے کہ میری جان کا تحفظ کیا جائے۔" اور یہ میرا حق پہنچتا ہے کہ خدا کے بعد قانون کا در کھٹکھٹاؤں۔ خدارا مجھے اس غنڈے اور اس کے بدمعاشوں

سے محفوظ رکھا جائے۔ اور عرضی پیش کر رہی ہوں کہ مجھے اگر یہ قتل بھی کر دے تو قانون
آپ سے انصاف کی امید کرتی ہوں !!
آپکی عین نوازش ہوگی۔

عرضی

اپنے ملک کی ایک ادبی۔ شاعرہ۔ ادیبہ۔ صحافی۔ بے سہارا۔ سارا شگفتہ۔

عطیہ!

یہ خط تمھیں اور تمھارے ایتر کو سلام کرنے کے لئے لکھا ہے زندگی کو اپنے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر دیتی رہی ہوں اور موت کو ایک سنسار۔ پیاری دوست! تمھیں کیا دوں ہ دیکھو میرے اسباب میں نہ روح رہی ہے نہ کوئی بدن۔ میں آج بہت اذیت میں ہوں وہ اذیت جو کنواریوں پہ لازم ہے مجھ پہ نہیں۔ وہ اذیت کہ سانپ چال بدن پہ رہ جائے وقت پہ رہ جائے اور میں ٹھہر جاؤں تمھارے دل میں ایک ٹھٹھری اور گرد آلود سانس کے ساتھ تمھارے انگاروں پہ میرے کپڑوں کی راکھ پڑی ہو۔ تمھاری اور اپنی اپنی چِتا کے گیت لکھیں اور آگ کو گانے دیں۔ اپنی پوری خاموشی کے ساتھ۔ میں کیا ہو گئی ہوں عطیہ!!

کہ آنسوؤں سے پہلے میں خاک تک پہنچ جاتی ہوں۔ آؤ! اپنے اپنے انگاروں کے بجھنے تک تو لیکن لگتا ہے زندگی ہمارے کھلونے کبھی بھی نہ توڑ سکے گی۔ لیکن یہ کھلونے ہمیں ضرور توڑ چکے ہیں۔ یہ ٹوٹے کھلونے عطیہ! آدھے میرے بچوں کو آدھے سعید کو دے دینا کہ آنے والی کل میں، میں بھی تمھیں بُک شیلف میں سجی ملوں گی اور تم بھی مجھے بُک شیلف میں سجی ملو گی اور لوگ سوچیں گے ہماری قبروں پر۔ یہ دونوں دوستیں کیسے مری ہوئی دوستیں ہیں۔ تمھاری سارا اپنے دکھوں سے تمھیں پیوندی کرتی ہے۔

تمھاری اپنی سارا
۱۱ اپریل ۱۹۸۴ء

سارا بنام سعید

(آخری خط)

سعید! تم نے زندگی میں جو خوشی، عزت محبت مجھے دی ہے، وہ زندگی مجھے آج تک کسی نے نہیں دی تھی۔ دنیا کی ساری زمین پر ایک تم ہو، تم ہو سعید! جس نے سارا کو جانا۔ سارا کو اور کسی نے کبھی نہیں جانا۔ تم میں وہ کشش ہے کہ میری چتا کی آگ کو تم نے پھول بنا دیا۔ اور ایسا میں نے پہلی بار دیکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنی زمین پر ایک انسان سے ملاقات، محبت اور جیون کی ہر طرف سچائی سے مجھے نوازا۔ یہ تم ہو۔

زندگی کے بیکراں عذابوں کے بعد تم سے ملاقات اور میرا اور تمہارا بیکراں پیار۔ زندگی کے کروڑوں دلوں پر اپنے دن کافی ہیں۔ کائنات ہمارے دلوں میں دھڑکی ہے۔ سو اس سے زیادہ خدا سے کچھ مانگنا اپنی تنگ نظری پر ماتم کرنے کے مترادف ہے۔

سمجھنا! آنکھیں بجھ گئیں تو میں پھر بھی تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں سو بھی گئی تو میرا دل ہمیشہ تمہارے لیے جاگتا رہے گا۔ اور یہ جاگ میں نے تم سے سیکھی اور تم نے بڑے فیض سے مجھے سکھائی۔ میں اپنے جنم کے تمام چراغوں سے کہہ دوں گی کہ جلتے رہنا کہ تم دیکھتے نہیں کہ سارا، سعید کو دیکھ

رہی ہے اور آگ ہمیشہ سے انسان کا احترام کرتی ہے۔
تم مجھے کسی کھونٹی پر بھی باندھ دیتے تو میرے لیے سعادت ہوتی۔
میں تمہارے اندر کتنی موجود ہوں اور رہوں گی۔ زندگی کی تلاش کو آج
ختم کرتی ہوں کہ میں نے جان لیا ہے زندگی تمہارے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ کچھ
بھی تو نہیں اتنے سفر اور اتنی کٹھنائیوں کے بعد، کائنات کا راز، کائنات
کی زبان، کائنات کا دل، کائنات کا مقصد، تم ہو سعید!
اور انسان کو زندگی میں کیا چاہیئے۔
خدا کا شکر ہے کہ وہ تمہاری صورت میں، مجھ سے آکر ملا۔
تیری سارا....... تیری اپنی سارا...... لفظ لکھنا بند کرتی ہوں....
تیری اپنی سارا......

۳۰ —— ۵ —— ۱۹۸۶

سعید بنام امرتا پریتم

(سارا کی موت پر)

امرتا جی! آداب! آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ سارا اب اس دنیا میں
نہیں ہے۔ چار اور پانچ جون کی درمیانی شب وہ دنیا سے کوچ کر گئی ڈاکٹری
رپورٹ کے مطابق وہ ریلوے لائن پر گری۔ اس کا دل فیل ہو گیا اور اوپر سے ٹرین
گزر گئی۔

امرتا جی! میری اتھاہ محبت بھی اسے زندگی میں واپس نہ لا سکی۔ میں نے
زندگی کی آخری حدوں تک اسے محبت دی۔ اور اس نے کئی گنا شدت کے ساتھ
مجھ سے محبت کی لیکن ہوا وہی جو منظورِ قدرت تھا۔ لیکن اب اس کی موت
میری زندگی میں سرایت کر گئی ہے۔ اس کی موت زندگی بن کر میری رگوں
میں دوڑ رہی ہے۔ اور لمحہ بہ لمحہ، دن بہ دن اور سال بہ سال میں اسکے قریب

ہوتا جاؤں گا۔

اکتیس مئی تک وہ میرے ساتھ تھی اور اسکی باتیں، اس کا انداز والہانہ تھا۔ عشق میں ڈوب کر وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی اور شدت محبت سے بے ہوش ہوگئی۔ دوبارہ ڈاکٹر بلایا گیا اور وہ ہوش میں آئی۔ اس کی اُتر جانے والی آنکھیں اور آخری باتیں میں سہہ نہ سکا۔

آپ کا سعید

سارا نام امرتا پریتم

شادی — شاید یہ ماں کی آخری خواہش تھی۔ جو میں نے پوری کی۔

امرتا! مبارک باد قبول کی بیماری زمین کے دستور کے مطابق ہمیں حرام سے حلال ہونا ہی پڑتا ہے۔

مجھے پاگل خانے سے آئے ابھی دو تین دن ہی ہوئے تھے کہ امی نے کہا "ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اگر تمہاری شادی ہو جائے تو تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ بیٹی! یہ تمہارا علاج ہے۔"

شادی میری تو آواز کالی پڑ گئی

"نہیں امی! میرے بدن سے تیرے کوکھ کی پرچھائیں نہیں جاتی"۔ ان دنوں پانچ چھ کی آنکھیں میرے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں بننا چاہتی تھیں۔ امی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ میں ان کے پاؤں دبا رہی تھی اچانک میں نے اُن سے کہا "اب تو ماں، تم روز روز بیمار رہنے لگی ہو۔"

وہ بولی "تمہیں دیکھ دیکھ کر۔ میرا کہا مان لو۔ چوڑیوں کی ہنسی میں شامل ہو جاؤ۔ جوان ہو۔ محلے والے بھی باتیں کرتے ہیں تیری بیٹی اکیلی سڑکوں پر گھومتی رہتی ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے ہو کر آتی ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے بیٹی!"

میں بہت کچھ سوچنے لگی۔ پھر ایک دن میں اور امی دھوپ تاپ رہے تھے کہ مجھے محسوس ہوا۔ امی آہیں بھر رہی ہے، اور چوری چوری مجھے دیکھتی ہے۔ میں نے کہا

"امّی! اگر میں آپ کا کہنا مان لوں تو؟"
"میری ساری بیماری دور ہو جائے گی۔ میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی"
"لیکن امّی! تم اکیلی رہ جاؤ گی"
"کتنے برس ہو گئے تیرا انکار سنتے ہوئے۔ تیرے یہ بہانے تو مجھے مرنے بھی نہیں دیتے۔ مجھے ذلتوں سے بچا لو بیٹی۔ ہاں کر دو۔ مانا کہ لڑکا بدصورت ہے۔ پڑھا لکھا بھی نہیں۔ لیکن اتنے پڑھے لکھوں نے بھی دکھ کے سوا نہیں کیا دیا ہے۔ یہ ٹھیک رہے گا"
"جیسے تیری مرضی ماں! لیکن جانتی ہو کہ چوڑیاں کبھی ہنسنے سے باز نہیں آئیں"
"شکست سے ڈرتی ہو؟"
"نہیں امی! اگر میری ہار سے تیری جیت ہوتی ہے تو ساری عمر ہار ناپسند کرونگی"
"پتہ نہیں، کیا کیا بولتی رہتی ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

. . . .

مشاعروں میں جانا بند۔ غیر مردوں سے ملاقات بند۔ اخباروں میں لکھنا بند۔ تم ہماری عزت ہو۔ لکھ پتی گھرانے کی بہو ہو۔ کھانے پینے کی تمہیں کوئی تنگی نہیں ہوگی۔ رہا تمہارا پاگل پن! یہ سب تمہاری بہانے بازی ہے۔ اصلی دودھ مکھن کھاؤ گی تو تندرست ہو جاؤ گی......"
حضرت بولے "ہمارے گھروں میں ڈاکٹروں کو بلانے کا رواج نہیں ہے" یعنی دوا دارو بھی بند۔
میں نے پڑوس کے بچوں سے دوا منگوائی اور پی کر سو گئی۔ آدھی رات کے وقت مجھ پر وحشت کا دورہ پڑا۔ اور میں صحن میں چلنے لگی۔ میری حالت دیکھ کر شوہر نے کہا کیا تم نشہ کرتی ہو؟ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری بیوی اتنی گھٹیا ہو سکتی ہے کہ وہ نشہ کرے۔"
ا۔ کس مصیبت کے ساتھ شادی ہو گئی ہے۔
۲۔ ہمارے گھروں میں عورت سگریٹ پیئے تو اسے گولی مار دیتے ہیں،

۳۔ 'پڑھنے لکھنے پر پابندی'

۴۔ 'کیا لکھ رہی ہو؟ اِدھر آؤ، میرے پاؤں دباؤ، بڑی آئی شاعرہ!

۵۔ ہر وقت زیور پہنے رہا کرو۔ اس سے عزت ہوتی ہے۔

۶۔ 'مشہور شاعرہ کی سانس اب میری مٹھی میں ہے.........

پندرہ دن تک تو میں خاموش رہی

"سونا دھات ہے اور میں سونے یعنی دھات سے زیادہ جیتی ہوں۔ میں ہنستی ہوں۔ ایک جبر سے دوسرے جبر تک"

"مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم لکھتی ہو۔ اپنا رویّہ درست کرلو۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔

"تم دو کوڑی کی شاعرہ، تیرا علم تو تجھے آدھی روٹی بھی نہیں دے سکتا۔ لکھنے پڑھنے کا فائدہ؟"

اے قفس! یہ تیری نہیں میری تھی.........

میں کس زمین کی آبرو ہوں ......

نہیں جانتی ......

پچیس دنوں کے بعد، میں نے لکھتی سے کہا 'مجھے طلاق چاہیئے۔

"نہیں دوں گا۔ کیا تکلیف ہے تمہیں۔ میں تمہیں جھگی سے اٹھا کر گھر تک لایا ہوں۔ بیس ہزار روپیہ تیرا حق مہر ہے"

"وہ میں نے تجھے معاف کیا......"

خیر، بڑی مشکلوں سے طلاق لی۔ اور سکون سے سوئی۔ میں جب دوبارہ امّی کے گھر آ گئی تو امّی نے بڑی ہمت سے مجھے گلے لگایا اور بولی، کوئی بات نہیں۔ میں سمجھوں گی تیری شادی ہی نہیں کی تھی۔ یہ تیرا گھر ہے۔ زیادہ سوچا نہ کر تیرے ذہن پر ڈور پڑی تو ہاتھ پہ اور بھی زخمی لکیر پڑ گئی پرانی دکان کا گڑ مہنگا ہوتا ہے۔
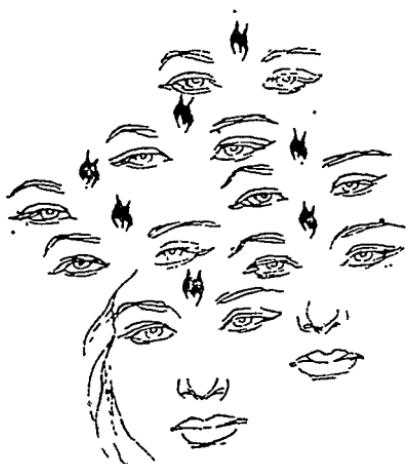
ویسے تو بہت سی باتیں ہوتی ہیں لیکن گھر کی باتیں سچی باتیں ہوتی ہیں۔ گھر سے سچا تعلق انسان کو درختوں میں بدل دیتا ہے، جن کے بیج اُس شروع ترین گھر کے ایک بہت ہی مخصوص گوشے میں خزانے کی طرح پوشیدہ ہوتے ہیں۔

میرے لئے وہ مخصوص گوشہ ایم سی۔ ۲۷۴ کی چار دیواری میں نہیں، بلکہ میری ماں کے حافظے میں ہے۔ میں اُس وقت تک زندہ ہوں، جب تک اپنی ماں کے حافظے میں موجود ہوں۔ جس دن میری ماں نے مجھے بھلا دیا، اُس دن نہ میں رہوں گی، نہ میری چھوٹی چھوٹی باتیں۔

میری ماں کو مجھ سے محبت ہے کہ نہیں۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں میرے لئے تو بس اتنی سی بات اہم ہے کہ وہ میری ماں ہے اور میں ابھی تک اُسے یاد ہوں۔ میں اس کے پاؤں کی مٹی کے برابر بھی نہیں ہوں۔ یہ احساس مجھے اپنے باپ کو دیکھ کر ہوا۔

نزع کے عالم میں ۷ بہنوں اور ۴ بھائیوں کے ہوتے ہوئے میرے باپ کا مجھے گلے لگانا۔ میری ضد کا میری بہنوں کے لئے طعنہ بن جانا ایک حقیقت ہے۔ گو کہ حقیقت وہ نہیں جو ہم کہتے ہیں بلکہ حقیقت وہ ہے جسے لمحے ظاہر کرتے ہیں۔

بچپن تو کاغذ کی ناؤ نالے کے سپرد کر دیتا ہے لیکن یہ بہاؤ جب دریاؤں سے مل کر سمندروں میں گرتا ہے تو ہمیں اپنی کشتیاں سوچ سمجھ کر پانیوں کے حوالے کرنی ہوتی ہیں۔ شاید اس لئے ۸ سال کی عمر میں بھی اپا، بہن بچوں کو دیکھ کر رونے لگتی تھی اور اپنے آنسو سب سے چھپانے کی کوشش کرتی تھی، حتیٰ کہ اپنی ماں سے بھی۔

شاعری میرے عشق کا سرمایہ نہیں بلکہ میری یہ فطرت کہ ہر اینٹ میرے

گھر کی اینٹ ہے اور جانوروں میں خود کو ڈھونڈھنے کی عادت ۔
حضرت علیؑ اور شیکسپیئر کے قول بچپن میں یاد رکھنا دوسروں کو بڑے فخر سے سنانا۔
پھر ایک سانپ کی طرح بل کھاتی خواہش کہ میری دوپہر کا نچوڑ دوسروں تک پہنچے۔
انھیں باتوں کے سائے میں میں نے شاعری شروع کی۔
میں پروز پوئم کہتی تھی لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ کیا ہے۔ لکھ کر پھاڑ دینا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ شاعری کا رشتہ ہمارے ساتھ خونی رشتوں سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے گندم اور ہم اور شاعری ۔ جیسے کافر نہ ہوتے تو آیت نہ ہوتی اسی طرح جذبات اور شاعری کا تعلق ہے۔
باورچی خانے سے لے کر آسمانوں تک شاعری کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ کائنات اور ہم الگ نہیں۔
جہاں تک پڑھنے کا تعلق ہے میں پڑھنے پہ کم یقین رکھتی ہوں۔
دیکھنے اور سمجھنے کو فوقیت دیتی ہوں۔
مصوّر کے ہاتھ
مالی کی چال
شاعر کے تیور ہی اُس کی شاعری کا آئینہ دار ہوتے ہیں
جیسے میں اکثر عذرا عباس اور انور سن رائے کے ساتھ چائے پیتی ہوں اور کیک کھاتی ہوں ـــــ فاطمہ حسن سنا ہے یونیورسٹی پھلانگ چکی میں تو ابھی تیرھویں میں ہوں۔
سنا تھا نقاد ہیں قمر جمیل اور سلیم احمد ـــــــــــــــــ
جب دیکھا تو ایسا محسوس ہوا یہ اپنی اپنی بیویوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کھاتے ہیں لیکن اُس چیونٹی کو نہیں دیکھتے جو برسات کی تیاری کرتی ہے انہیں کے آٹے کے کنستروں سے۔
وہ لفظ چاند ہوئے جو پرندوں کو رٹائے گئے تھے اور اب ماضی کا یہ سخت سا لہجہ

جس کے پائے ہزار داستان ہیں۔ ہم بچے نہیں اب تو ہم جادوئی چراغ الہ دین سے نہیں ڈرتے ۔

خیر قمر جمیل تو مصوّر بھی ہیں۔

لیکن سلیم احمد کی شاعری زندگی کی شاعری ہے اور زندگی کی شاعری سلیم احمد نے اُس وقت بھی کی جب میرے بچے کو دفن ہوئے ایک گھنٹہ ہوا تھا۔

تو میں کیسے انہیں شاعر تسلیم نہ کروں۔

ہمارے جذبے کبھی اندھے نہیں ہو سکتے۔ ہم شاعر ہیں ـــــ

افتخار جالب کراچی آ گئے ہیں۔ انہیں سوچ لینا چاہیئے یہاں سمندری آب و ہوا ہے۔ زنگ بھی کالا پڑ جاتا ہے۔ مون سون کی ہوائیں جو چلتی ہیں۔ یہاں بسوں کا دھواں سانسوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ دودھ دہی دستیاب نہیں ہے ـــــ

جالب صاحب کو میرا خیال ہے سفید رنگ پسند ہے۔ خیال رہے سفید رنگ پہ داغ بہت جلد لگتا ہے ـــــ

جالب صاحب آپ کی چینی کا بہت بہت شکریہ۔

اُمید ہے آئندہ آپ مجھے نمک دیں گے۔ کیونکہ میں نمکین چیزیں شوق سے کھاتی ہوں۔ چٹ پٹی چیزیں کھانے سے کان، آنکھ، زبان کے ذائقے جاری رہتے ہیں ـــ

مجھے پھولوں میں سفید گلاب پسند ہے اور سفید لباس۔

خود کو بگاڑنا نہیں تمہیں سنوارنا جانتے ہیں۔ پتھروں پہ چل کر تکیہ لائیں گے۔ تو ایک پتھر کی اُمید ضرور رکھیں گے۔

شیکسپیئر، افلاطون، ارسطو، وغیرہ، وغیرہ کتابی عطیہ دے گئے۔ اب ہم یہ کتابیں کھول کھول کر بحث کرتے ہیں بند کمروں میں ـــــ

میں چاہتی ہوں سارہ احمد کی بات سارہ احمد کے قدم سے شروع ہو۔

صدیوں کے سینے پر رستا ناسور میرے لئے عورتوں کی غلامی ہے

جس کی " لٹھ باز" بولی لگاتے ہیں ـــــ

مجھے تم سے محبت ہے لیکن مجھے اپنی ماں کے شوہر سے بھی محبت ہے اور اپنی بہنوں کے شوہروں سے۔ میرے ہاتھ ہزاروں مردوں کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ جن کی آنکھیں اپنے ہی سمتوں میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ ہمیں زندہ بازوؤں کو اپنانا ہے۔ اُن ہاتھوں کو ڈھونڈھنا ہے جن ہاتھوں سے ہم اپنے بیٹوں کو نہلاتے ہیں ـــــ

یہ قیدِ مسلسل اُس بھینس کی موت ضرور بنے گی۔ جس کا کام دودھ دینا، گھاس چرنا۔ لاٹھیوں کے موسم سہنا۔ یہ حقیقت ہے آجکل کا مرد بھول رہا ہے کہ پھل دینے والے تو پیڑوں کو بھی کاٹنا گناہِ عظیم ہے۔

تم کھاتے ہو قسم اپنے نطفہ کی۔ نہیں تم کچھ نہیں جانتے، زندگیوں کے راز ہماری کھوہ میں جنم لیتے ہیں پھر بھی تمھیں ہم پہ یقین نہیں۔ تمھاری نسلوں کی پہچان ہم کرتے ہیں۔ اور سب سے بڑے راز کی پیشین گوئی کیا فرشتوں نے تم کو دی تھی۔

پڑے ہیں ہماری شرافت کے کئی سال تم ایک سال تو دو۔

مسور کی دال ہم نے پکائی چلو تڑکا تم ہی لگادو، لیکن تم تو چلے مٹرک ور ٹرک یہ نہ جانا کس نے لگائے یہ سنگِ میل، کاٹی کئی راتیں جس نے تمھیں پانے کے لئے اُسی کی بیٹی کی تم چادر لے بھاگتے ہو، تمھاری آنکھوں کی سفیدی پہ داغ ضرور لگے گا ـــــ

سفید چیزیں لاکھ فرار چاہیں فرار نہیں ہو سکتیں۔

چار دیواری کے نام پہ تم دھبہ ہو، یہ دھرتی ہمارا گھر ہے کھلا آسمان ہماری چھت تم کون ہوتے ہو چاند سورج کو چھپانے والے ـــــ

اگر تم مرد ہوتے تو حوا سے محبت کرتے لیکن تم تو شاید اپنے باپ کی ریچھ سے دوستی بھول گئے تھے۔ کیوں؟ کس لئے؟

تم وہ کہاں جسے ہم ڈھونڈھتے ہیں، تم تو ڈھنڈورا پیٹنے والے ہو ـــــ

تمھیں تو اپنے بھائی پہ اعتماد نہیں الزام ہمیں دیتے ہو۔ جب ہم تمھیں پہلی اذان سنانے

کے لئے مسجدوں کا رُخ کرتے ہیں تو تمہارے دسیوں بھائی اپنی بھابھی کو دیکھتے ہیں۔
چنگاری کو دبانے والے اپنے مسخ شدہ چہرے آج ہی کیوں نہیں دیکھ لیتے۔
کسی کو آنکھیں دِکھاتے ہو کسی پہ بچھاتے ہو، بحر حال پ___
یہ چار دیواروں کے مزار تمہاری آنکھوں کے ہیں۔
وضو ہم بھی کرتے ہیں، سنت ہم بھی پڑھتے ہیں، سجدہ ہم بھی کرتے ہیں۔
برقع تم بھی پہنو گے۔
سر تم بھی ڈھکو گے۔
منے کے ابا دینا ذرا ۴ آنے۔ یہ فقیروں سی ادائیں کب ہماری تھیں۔ فرعونیت تم
نے کی، عورت کبھی فرعون نہ تھی نہ ہے نہ کبھی پیدا ہوئی۔
یہ تو ہمارے اٹل فیصلے ہیں جنہیں اب صرف حیا کی ضرورت ہے۔
روٹی پتھر نہیں، دھات نہیں، جاگیر نہیں روٹی مسور کی دال کے ساتھ اچھی لگتی ہے تم
تو اچار کے ساتھ بھی اچھے نہ لگے___
روٹی ایک طرف پڑے پڑے جل جاتی ہے۔ اب روٹی کے دونوں پلے انصاف
چاہتے ہیں۔
تم روٹی کا وہ پاسہ ہو جو راکھ کے علاوہ اب کچھ نہیں۔ تم نے ہاتھ میں دیا تھام رکھا
ہے اُس کی راکھ کے ساتھ ساتھ تمہارے ہاتھ کی لکیریں غائب ہو چکی ہیں۔
چراغ روشن ہو اور کمرہ روشن نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے۔
ہم ذرہ ذرہ زندہ کریں گے۔ چار چار لاشوں کے تم مجازی خدا بنے بیٹھے ہو حالانکہ اچھے
کفن چور تک نہیں ہو۔
تمہاری آنکھیں تو پائنچوں سے اوپر جاتی ہی نہیں ہیں۔
کیسے خاموشی سے چلی جاؤں، میری پردادی، دادی، پرنانی، نانی اور ستارے سے
ستارے گویا آسمان ہی نہ چھوڑا تم نے پھر بھی دعویٰ ہے۔

ناشتہ تیار کیا کرو!

میری کج اداؤں کو بھی تو دیکھو

بہت دیکھیں دکانیں بہت دیکھے بازار۔ میری دادی کی اماں سے لے کر میری بیٹی تک تم "کیدو" کا پارٹ ادا کر رہے ہو۔ میری رگوں میں جس کا خون دوڑ رہا ہے وہ بھی دو ندیوں کا تیراک تھا۔ مینڈک تھا گندے تالاب کا جس میں تم ڈوبنے والے ہو۔ اپنی خبیث روحوں کے ساتھ اپنی سفاکی کے ساتھ۔ اپنے جہل کے ساتھ۔

کئی موسم ہم نظر بند رہے

آنکھیں اٹھا کر اب دیکھ بھی لو پتھر کا صنم زندہ ہوا ہے۔

یہ چھوٹے بڑے جملے میرے شب و روز ہیں اور شب و روز ہی سے ہم ایک دوسرے کو پاتے ہیں۔ حقیقت شاعری ہے شاعری حقیقت ہے۔ باقی سب غلط

میں تو کہتی ہوں کہ

پیٹ کی آگ آیتوں کی روح ہے

پاگل خانہ!

مجھے ہوش آیا تو میں کراچی کے اسپتال یعنی پاگل خانے میں تھی میرے اردگرد پاگل عورتیں گھوم رہی تھیں۔ میں کونے میں دبک گئی اور سلاخوں کو دیکھنے لگی۔ دروازے پر نانے کی آنکھ لگی تھی یہ قید ایک نئے انداز سے میرے بستر پر لپٹی تھی۔ مجھے اپنے تیسرے شوہر کے ظلم یاد آئے اور ایک نفرت جو قید سے بڑی تھی میرا شوہر بے جا مجھے اتنا مارتا کہ جسم پر نیل پڑ جاتے۔ بے قصوری کی سزا جرم سے بڑی ہوتی ہے وجہ یہ تھی کہ وہ میری شاعری سے ڈرا ہوا تھا۔ اور احساس کمتری کی وجہ سے مجھ پر ظلم کرتا۔ حالانکہ میں اس کے بوٹ پالش کرتی تمام گھر والوں کے کپڑے دھوتی۔ فاقہ برداشت کرتی! ساس نندوں کی گالیاں سنتی جیسے پڑوس میں بھی جانے کی اجازت نہیں تھی ہر بات پر مجھے آوارہ کہا جاتا حالانکہ میرے پاس چونی تک نہ تھی اس نے شادی کتّے کی طرح نوٹ لوٹ کر کی تھی شادی کے تیسرے روز گرگٹ کی طرح رنگ بدل گیا۔ میں چوڑی کی طرح ٹوٹ گئی اور چار دیواری کی پناہ میں وہ کچھ ہوا جو سڑکوں پر بھی نہیں ہوتا۔ میری حیثیت ایک کتیا کی طرح تھی۔ وہ جب چاہتا میرے جسم پر بھونکتا کہ میں خوف زدہ ہو جاتی۔ پھر مجھے ایک ماہ میں دورے پڑنے لگے۔ میں طلاق مانگتی۔ تو وہ مجھے اور مارتا۔ نندیں گالیاں دیتیں۔ میرے پڑھنے سے اسے تکلیف ہوتی تو میں دن بھر رویا کرتی۔ میرے گھر والے بھی میرے گھر نہ آتے۔ کہ میں نے پسند سے شادی کی تھی۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ چھ ماہ کے جبر اور تشدّد کے ساتھ میں نے طلاق لے لی۔ مجھے دوسری زندگی مل گئی لیکن میں ذہنی توازن کھو

بیٹھی۔ گلیوں میں گھومتی رہتی۔ غلط لفظ بولتی رہتی اور پھر جو شاعر حضرات تھے انہوں نے میری دیوانگی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مجھے اور ذلیل کر دیا میں پاگل ہو گئی۔ تو میری امی مجھے پاگل خانے چھوڑ آئی علاج کے لئے۔ جب مجھے ہوش آیا ایک عورت زنجیروں سے سجی بیٹھی تھی۔ دوسری عورت نے خلا میں آنکھیں باندھ رکھی تھیں تیسری عورت کی گھڑی سے وقت گذر گیا تھا میں ان دکھوں کو دیکھ کر بہت روئی۔ میں شاعرہ ہوں۔ میں نے ان کی باتیں لکھنا شروع کیں۔

ایک عورت مسلسل کہتی رہتی۔ میرا ازاربند مت کھولو۔ دوسری عورت میں گھر نہیں جانا چاہتی، کہیں ڈاکٹر میری چھٹی نہ کر دے میں یہیں رہنا چاہتی ہوں، ایک عورت جو پاگل نہیں تھی۔ اس کا بھائی تھا اسے پاگل خانے چھوڑ گیا تھا وہ کہتی میں پاگل نہیں ہوں وہ میری جائداد پر قبضہ کرنے کے لئے مجھے یہاں چھوڑ گیا ہے وہ واقعی پاگل نہیں تھی۔

ایک عورت نے کہا "میرا شوہر دلا ہے اور مجھ سے پیشہ کرواتا ہے میں شریف خاندان کی لڑکی ہوں ایک دوست پولیس والے نے مجھ کو پکڑا۔ تصویریں اخباروں میں آئیں اور جب پولیس مجھے پکڑ کر لے گئی تو حوالات میں دس پولیس والوں نے میرے ساتھ زنا کیا اور پھر مجھے مارا بھی۔ اس پر میں ذہنی توازن کھو بیٹھی ہوں"۔ ایک اور پگلی نے کہا "میرا دیور اور میرا شوہر دونوں میرے ساتھ سوتے ہیں اور مجھے بلیک میل کرتے ہیں" ایک کنواری پگلی نے کہا کہ "محلے کے غنڈے نے مجھے اغوا کیا اور رات بھر پانچ مرد مجھے لوٹتے رہے"۔ اور پانچ عورتیں اس وجہ سے بیمار تھیں کہ ان کے شوہر محبت کرتے تو تھے کماتے نہیں تھے وہ بچوں کو پالنے کے لئے جھاڑو برتن کرتی ھیں۔

ایک بہت پڑھی لکھی تھی۔ وہ اور میں زیادہ تر ساتھ رہتیں۔ میں پہروں اس سے باتیں کیا کرتی۔ ایک خاص وقت پر میوزک لگایا جاتا۔ گانے کے بول تھے

آج میں آزاد ہوں دنیا کے چمن میں

میں اٹھی اور ناچنے لگی۔ پھر تمام عورتیں ناچنے لگیں۔ رقص ختم ہوا تو میری دوست رونے لگی۔ میں نے پوچھا کیوں رو رہی ہو۔ اس نے بتایا۔ مجھے ایک سے محبت تھی۔ میں نے گھر چھوڑا۔ بچہ چھوڑا اور میرے عاشق نے میری تصویریں اتاریں اور مجھ سے اسمگلنگ کروانے لگا اور میں بلیک میل ہو گئی اور پھر اس نے بھرپور قہقہہ لگایا! اور پھر رقص کرنے لگی۔ ایک بڑی بی نے کہا "میرا بیٹا میرے ساتھ ایک روز زبردستی سو گیا" اور پھر ایک اور قہقہے میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر آتے اور ایک ایک منٹ گفتگو کرتے۔ ایک منٹ کا مطلب ہے۔ نوٹ۔ علاج نہیں۔

پاگلوں کا علاج کیا ایسے کرتے ہیں کوئی عورت شور مچاتی تو الیکٹرک شاک لگا دیتے۔ ہم جنرل وارڈ کے پاگل تھے۔ اس لئے ہماری کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ ایک عورت دوسری عورت کا پھل کھا جاتی۔ ایک عورت میرے سگریٹ پی گئی ایک فروٹ کھا گئی۔ ایک نے کپڑے پہن لئے۔ آپس میں عورتیں اتنا لڑتیں کہ ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ ڈالتیں۔ میں چلاتی رہتی۔ چائے دو۔ چائے پلا دو۔ سگریٹ لا دو۔ لیکن کوئی نہ سنتا۔ وقت مقررہ پر روٹی آتی۔ گندے برتنوں میں۔ کمرا اتنا گندہ تھا کہ میں ایک دو نوالہ بھی زہر مار نہ کرتی۔ ایک ڈاکٹر مجھ سے لڑ پڑا۔ مجھے دورہ پڑ گیا۔ چیف سسٹر دلاسہ دیتی رہی۔ ڈاکٹر نہیں آیا۔

میں نے اسپتال کی دیوار پر لکھا "نازی کیمپ" اور ڈاکٹر سے کہا کہ میں کالم لکھوں گی تمہارے خلاف۔ کالم تو کتنی بار لکھے جا چکے ہیں۔ جب انصاف کے صدقے میری چھٹی ہوئی تو میں بہت روئی۔ میری عورتیں مجھ سے بچھڑ کر پھر پاگل خانے میں رہ گئی تھیں۔ سلاخوں سے تالا کھولا گیا اور میں دروازے کے باہر۔ ساری عورتیں مجھے دیکھنے لگیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔

سارا اب تو تم اصل پاگل خانے میں جا رہی ہو۔

۸-۱-۱۹۸۳ ماں کی موت پر!

نفرتوں کے جنم دن میں ایک اور آواز شامل ہوئی جو کبھی رُوح میں نہ سُنی گئی۔

سن تراسی کا نیا سال میری ماں کی موت کی مبارک باد دے کر گیا ہے امرتا آج میری ماں مرگئی ہے۔ میں نے بھی ماں کے خون کا قصاص دیا ہے میرے لفظ جو اس کے لہو کے قطرے قطرے کو دکھاتے تھے لیکن میں پھر بھی اخبار کی سرخیوں سے خراج تحسین کرتی رہی، لیکن میں ماں کے لہو کے قطروں سے دعائیں حاصل کرتی رہی۔ میں ماں کی کوکھ کا زہر ہوں جو اس کی ہڈیوں میں سرایت کر گیا۔ اور ماں مرگئی اس کی آخری آنکھوں میں میرا چھپاوا تھا میں انسانیت کے نام پر اپنی ماں کو شکار کرتی رہی۔ میرے نام کی جگہ ہمیشہ گالی لکھی جائے۔ ماں کی خالی آنکھوں کی بیٹی کتنی کھوکھلی تھی ساری زمینوں پر رسیاں کس دی جائیں کہ علم کے نام پہ میری آنکھوں کو پھانسی دے دی گئی۔ میں انسانوں کا مقدر لکھنے لگی ننگوں کے اعضاء گنتی رہی۔ میں نے اپنی ماں کی کوکھ کئی مردوں سے داغ دی تھی اس لئے بیٹیوں کی بیل سے میری بیٹی بھی داغی جائے گی۔ خدا کے انصاف کے ایک پلڑے کا نام سزا ہے لفظوں کے کٹورے میں، میں نے زہر چھپا کر رکھا تھا یہ زہر میری ماں نے کیوں پی لیا۔؟

میں اتنی انجان نہیں تھی میں جانتی تھی میں اپنی ماں کو قتل کر رہی ہوں اور میں نے اپنی ماں کو قتل کیا۔ اپنے جھوٹ سے اور لوگ کہتے ہیں تمہاری ماں کی قبر سچی ہے۔ میں جھوٹ سے پہلے یقیناً سچی رہی ہوں گی! لیکن میں نہیں

جانتی جھوٹ کا روگ

میں کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ میری آنکھیں مر گئی ہیں۔ میری آنکھیں مر گئی تھیں
جبھی تو میری ماں مر گئی ہے۔ کہاں ہے ماں ؟ نہ میری آنکھوں میں، نہ میری کوکھ
میں، نہ میری کوکھ میں امڑنا۔۔۔

مجھے تو سادے ورق سے زیادہ چُپ رہنے کا حق۔ میں نے جس دن اپنا
حق بانٹا تھا میری ماں تو اسی دن مر گئی تھی آج تو میرے پستانوں میں بھی زہر
ٹھہر رہا ہے۔ اگر میرے بچے میرے پاس آئے تو مر جائیں گے انہیں دور رکھو۔ کہ یہ
اخباروں کی سرخیاں بننے والی شاعرہ کے بچے ہیں۔ میں انا کے جہنم میں جل رہی
ہوں۔ میں نے ماں کے دھڑکتے دل پر کبھی ہاتھ نہیں رکھا کہ میرے ہاتھ لفظ سے
زیادہ نہیں رینگ سکتے تھے۔

میری ماں مری ہے تو مجھے احساس ہوا ہے میرے بچے بھی ماں کی خودداریوں
سے مر گئے ہوں گے کوئی زندہ نہیں ؟ کیا میرے بچے بھی ؟ کہاں ہوں گے۔ میرے
پاس تو نہیں۔ میں کون سی زندہ رہ گئی ہوں۔ آنکھوں کی سڑانڈ سے مجھے کچھ نظر
نہیں آرہا۔ جتنی مائیں زندہ ہیں کیونکر میرے لئے دعا مانگیں۔ آج تو نہ میں ماں
والی ہوں نہ میں بیٹی والی۔ سوگ سے گھر ابھرا پڑا ہے۔ دور سے لوگ آن پہنچیں
گے۔ میری چھ بہنیں بھی آئی ہیں ان کی چیخیں تو مجھے بازار میں لے آئی ہیں۔ شگفتہ
تمہاری وجہ سے ہماری ماں مر گئی ہے۔ اسے صرف تمہارا دکھ تھا۔۔۔

اگر میں دکھ سے زیادہ شرمندہ ہوتی تو قبر سے زیادہ مر نہیں سکتی تمہاری
آنکھیں مجھے اتنا کیوں ٹٹولتی ہیں۔ میری ماں مردہ۔ میرے جھوٹ مردہ۔ میرا صبر
مردہ۔ میری آج مردہ میری کل مردہ

میں ایک ڈولی میں مرتی ہوں تو دوسری ڈولی تیار ہو جاتی ہے۔

آج فلم دیکھنے گئی تو ایک فالتو کتا پیچھے لگ گیا۔
سوچ رہا ہوگا کوئی ٹکڑا میرے انتظار میں ہوگا۔
لیکن جب پکچر ہاؤس پہنچی۔ تو اکیلا ہاتھ ٹکڑے کی طرف بڑھا دیا۔
تو شاید اُس کی گھڑی کا وقت ایک ہو گیا ہو۔
لیکن میں سیکنڈ / سیکنڈ چلتی ہوئی اندھیرے کو ٹٹولنے لگی۔ اور آج ہی ملامت میں اضافہ ہوا۔
رکشے پہ جا رہی تھی۔ کہ دیکھا۔ ایک اپاہج بچہ عمر تقریباً آٹھ برس۔ پہیوں والے ٹھیلے پہ بھاگ رہا ہے اور دو اخبار بیچنے والے بچے، اُسے تنگ کر رہے تھے۔
اُس نے تیزی سے ٹھیلا آگے لڑھکا دیا اور ہاتھوں سے منع کرنے لگا۔
میں سگنل کی قید میں آگئی اور تیزی سے میرا رکشہ گزر گیا۔
انسانی ٹکٹ دیکھو۔
میں کاغذ خرید رہی تھی۔
میں نے اس ٹکٹ کو سانس نہیں لینے دیا۔
کروٹ کروٹ ضمیری سجائے بیٹھی تھی۔
لیکن اتنے بڑے ہال میں کون جانتا تھا۔
کہ میں انسانی زنجیر کی اس وقت سب سے زیادہ کمزور کڑی تھی۔
لباسوں کے زنگ بھی تو آخر جسم پہ کوئی زنگ چھوڑتے ہی ہیں۔
رات پورے لباس سے ہے
اور چراغ تو میری ماں کے زمانے میں دیکھتے تھے۔

گھڑی میں اس وقت رات کی دو آنکھیں ہیں۔
یہ رات تو ملنے کے لئے پھر بچھڑ جائے گی۔
لیکن وہ اپاہج بچھڑا بچہ اب مجھے کبھی نہیں ملے گا۔
سگنل نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔
یا میری روشنی سگنل سے بھی کم تھی۔
اُس وقت میرا کوئی رنگ کام نہیں آیا۔
کاش کوئی ان دیوانوں کے قریب ہوتا
تو میرے اقرار کو جہنم رسید کرتا۔
سائے میں دیکھو ناخن نظر نہیں آتے۔
میں اپنا عکس کمرے میں دُہرا رہی ہوں۔
اور لکھنے تو یوں بیٹھی ہوں۔
جیسے کوئی چوہیا شہر کی ناک میں بیٹھ جائے۔
کیا کروں پہلو بدل بدل کے شاید کھڑی ہو جاؤں۔
لیکن مجھے کھڑے ہونے کا اتنا شوق کیوں ہے۔
عورت تو انسان کو جنم دینے کے بعد بھی کھڑی نہیں ہوتی۔
یہ کیسی کسوٹی ہے۔ ہمیشہ پتھر کی ہوتی ہے
نیند میں آنکھیں رکھتی ہوں تو اور جاگ جاتی ہوں۔

وہ سبز بتی

وہ بچہ

اور پھر میری اپاہج آنکھوں کا مجھ میں حل ہو جانا۔
یہ کیسا مذاق ہے
کانٹے پہ کوئی موسم نہیں آتا۔

اسی لئے اپنے اعضاء کی بولیاں سمجھنے لگی ہوں۔
وہ سامنے سارا   کونے میں بدک گئی ہے۔
جیسے پھر کبھی کوئی چہرا اہا نہیں آنا ـــ
پچھلے دِنوں بہت بیمار تھی تو مصنوعی نقاد کے ہاں چلی گئی۔
بھابھی! رتی ماشہ لہو چھن چھن کرتی بولی۔
پرس میں تمھاری دوا کے علاوہ کتنے پیسے ہیں۔
میں نے نیم بے ہوشی کے عالم میں اُسے نوٹ کا رنگ گنوایا۔
تو یوں میری ایک رات انسانی سرائے میں بسر ہوئی۔
آخری پائی تک ٹھیک رہتی ہوں۔
پھر کیا کھلانے لگتی ہوں۔
بس۔ اپنے اپنے بس کی بات ہے۔
یا اپنے اپنے روگ کی بات ہے۔
آزادی کا عَلَم تو سینہ پیٹنے تک ہے۔
چھ چار منٹ کی بھوک اور دو چار نوالے کی تاریخ۔
باقی تو اپنی اپنی سطح کا گھپلا ہوتا ہے ـــ
جذبوں کی پرکار الگ خالی انسان پر زاویے بناتی چلی جاتی اور بات بات پہ ہم تقسیم ہوتے رہتے ہیں ـــ
تنہائی کی لونڈی اتنے حرام کے بچے جنتی ہے۔
کہ ایک ایک بچے کو بیاہنے کے لئے
وقت کو حلال کرنا پڑتا ہے۔
کوئی دوست اسی لئے نہیں پال رکھا
کہ کہتے ہیں عمر کی ابھی کچی ہوں ـــ

سو لوگ بھی ناخن میں پھنسے ملتے ہیں ـــــ
منہ کالا ہونے سے تو بہتر ہے زبان سفید پڑ جائے۔
ابھی تک تو گندمی رنگ کہلاتا ہے ـــــ
اور یہ اپاہج رنگ ہی تو جاگ رہا ہے ـ جو چلنا چاہتا ہے۔
لیکن سگنل کے پاس تین جذبے ہیں۔ دو نہیں ـــــ
بس اکیلے گھومتی رہتی ہوں۔
اور جانو! محلے کے لوگ کیا سوچتے ہوں گے۔
اور میں کیا سوچتی ہوں گی ـــــ
جب جی بھر کے تماشے دیکھ چکتی ہوں
تو سفر کے لئے قطار میں بے ایمانی کرتی ہوں
اس بیس پچیس منٹ میں خوف کی ہر گلک کو توڑ کر اس کے سکے گنتی ہوں۔ کبھی کم
ہو جاتی ہوں اور کبھی زیادہ ـــــ
بس سٹاپ سے گھر پندرہ منٹ پر ہے۔
کوئی نہ کوئی کاندھا دینے آ ہی جاتا ہے۔
مُردے! سمجھتے ہیں عورت سے زیادہ کوئی اچھی قبر نہیں ہے۔
دروازے کو آزاد کرتے ہی
میرا گھر شروع ہوتا ہے ۔
قلم اور کچھ سیاہیاں۔
اور پھر ورق کا فرش دھونے بیٹھ جاتی ہوں۔
زمین اور دیوار کے سہارے ایک گڑیا کھڑی ہے۔
اس سے میری بیٹی کھیلا کرتی تھی۔
گڑیا کچھ مدھم مدھم سی لگتی ہے۔

ہاں میری بیٹی کی عمر جو گھٹ رہی ہے۔
وقت سوتا کہاں ہے۔
کبھی مجھے پستانوں سے گھٹاتا ہے۔
کبھی پورے دنوں کے بعد بھی شیر چکھنے نہیں آتا۔
بس روٹی بدن کو کھنگال کے کھا رہی ہوں۔
خالی خالی دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔
اور فاصلوں کا بین کیسے کرتی ـــــ
سہاگنیں تک اپنی بیٹیوں کو رخصت کر دیتی ہیں۔
میں تو پھر لمحے رکھتی ہوں
میں خالی جھولا اس لئے جھول رہی ہوں
کہ حدیث اور نیکیاں مجھے رٹائی گئیں تھیں۔
میں نیکیوں کے آگے زبان نہیں نکال سکتی تھی ـــــ
سو جنم کے لئے میں نے نئی آنکھ دریافت کی۔
وہ بھی امرتا اپاہج آنکھ نکلی۔
اب بتاؤ! میں خسارے کے کتنے قرآن حفظ کروں۔
کہ سپارہ سپارہ پڑھی جاؤں ـــــ
کوئی بُرا کہہ دے تو اچارہ تک بھول جاتی ہوں۔
اور اپنے ارادے میں کئی سجدے سجا لیتی ہوں۔
حالانکہ جانتی ہوں
کہ نماز مجھے کبھی نہیں پڑھے گی۔
کسی نے مجھے لکھا!
کہ ڈوبتے سورج سے سگریٹ جلانے کی عادت نے آپ کو پورے نظام شمسی کی

ماں بنا دیا ہے۔

دیکھو!

حالانکہ اپنا بچہ تک میرے پاس نہیں ہے۔

میری اوقات کے ڈھونگ دیکھو۔

سورج کے گھٹنے بڑھنے پہ مجھے رکھتے ہیں۔

حالانکہ میں اپنی سگریٹ کی اچھی طرح اوقات جانتی ہوں

ڈر کے اتنے نخرے ہیں،

کہ خواجہ سرا رات بھر تنگ کرتے ہیں۔

وطن سے نکلتی ہوں تو زمین شروع ہو جاتی ہے۔

زمین سے نکلتی ہوں تو وطن شروع ہو جاتا ہے۔

اور بار بار بھول جاتی ہوں۔

کہ کتا ہڈی دیر تک چباتا ہے۔

بہت جی چاہتا ہے۔ کچھ سنوں کچھ سناؤں۔

لیکن ان کے اعضاء اتنے اُگ چکے ہیں

کہ میری تو جھونپڑی تک نہیں بن سکتی۔

سو تم سے چل سو چل باتیں شروع کر دیتی ہوں۔

چار کتابیں۔ ایک ناول۔ ایک خود نوشت اب تک لکھ چکی ہوں۔

ایک مجموعہ کے لئے پھر قدم باندھ لوں گی۔

اور دو سال بعد اس جسم کو تھوک دوں گی۔

کہ آخری گالی تک میں نے صبر کا وعدہ کیا تھا۔

میں نفرت کرتی ہوں اپنی نیت سے

میں نفرت کرتی کچے انسانوں سے

میں نفرت کرتی ہوں۔ اپنے جذبوں سے

جنہوں نے میرے جسم سی پٹاری میں پھنکارنا لکھا ہے
وہ زندگی کیا۔
جو ایک اپاہج بچے کو مکمل نہ کر سکے۔
لہو کو کوئی رنگ نہ دے سکے۔
اور انسان کی زبان نہ سیکھ سکے۔
ایک تنقیدی نشست سے۔
تیجا کھسم اپنی دوکان سے میرے پیچھے آیا۔
اور میرا ہاتھ چومنے کی کوشش کی۔
طلاق یافتہ شاید بھول گیا تھا۔
کہ میں مداریوں کے لفظ تھوک چکی ہوں۔
اُس کی مار کے تو ابھی تک میرے ہاتھوں پہ نیل پڑے تھے۔
وہ دوسرا نیل کیسے ڈال سکتا تھا ـــ
زیرِ ناف جیسے ہلکا کتا
نہیں جانتا۔ کہ وہ اپنے گز سے مجھے کب ناپ سکا!
اور لطیفہ سنو!
تینوں طلاق یافتہ شوہر ـــ مجھے باری باری پیغام بھیجتے ہیں۔
چار زخموں کے سامنے میری ہو جاؤ ـــ
جیسے کردار گواہیوں پر رکھا ہے ـــ
میں نے تین بار نکاح کی گالی کھائی ہے۔
اور جہاں گواہی ہو وہاں انسان کا کیا کام۔
لو! گڑیا کے پاس دو گڈے بھی کھڑے ہیں ـــ
ان کے لئے کھلونے ہی تو بنا رہی ہوں۔

کسی بھی شیلف پہ سبھی ان کو ملتی رہوں گی۔
جب یہ گڈے گڑیا پرانے ہو جائیں گے۔
تو صرف شیلف تبدیل ہو جائے گی۔

. .

تم بول پڑیں، تو میں چپ ہو جاؤں گا

سارا شگفتہ

بیس مارچ ۱۹۸۱ء

پرندہ کمرے میں رہ گیا

رات نے جب گھڑیوں سے وقت اُٹھا لیا !!
گھنٹی کی تیز آواز نے سارے پردوں کا رنگ اڑا دیا
کمرے میں چار آدمیوں نے اپنی اپنی سانسیں لیں
سانسیں مختلف رنگوں میں تھیں
ایک آدمی پُرانے کیلنڈر پر نشان لگا رہا تھا
دوسرا نیا کیلنڈر ہاتھ میں مروڑ رہا تھا
تیسرے کا چہرہ چوتھے آدمی کے چہرے پر لگ گیا تھا
آدمی تین تھے
یہ تین سمتیں چوکور کمرے کے خالی کونے کو دیکھ رہی تھیں
انہی تین سمتوں کو کل سارا شہر بننا تھا
وہ تینوں
کمرے کے تینوں کونوں میں جا کر کھڑے ہو گئے
اور سوچنے لگے
کس کا کونا ہے جو خالی رہ گیا ہے
اچانک پردہ ہلا
اور ایک پرندہ
اس کونے میں آ کر بیٹھ گیا

تینوں کے مُنہ سے نکلا

"معصوم"

انہیں پتا چلا کہ وہ تینوں وقت کی قید میں تھے

تینوں نے آگ جلائی

اور بولے!

آگ جلنے تک یہ سمتیں ہماری رہیں گی

"آگ چوتھے کونے میں لگائی گئی تھی"

زندگی کے رُخ بڑھتے جا رہے تھے

سورج نے چار کرنیں کمرے کے اندر پھینکیں

انہوں نے پانچ پانچ گز کا سنہری پن اپنے گرد لپیٹا

سورج کی تین بانہیں ٹوٹ گئیں

انہوں نے اپنی ایک ایک انگلی کاٹی

اور بولے!

"ہم نے اپنی انگلیوں سے زندگی کا سکوت توڑا"

پرندہ کمرے میں رہ گیا

ستیارتھی کے نام میرے دُکھ

کھیلتے کھیلتے

جس دن مٹی میرے پیروں کی لکیروں سے پاگل ہوئی۔
اور شرم جوان ہوئی۔
پہلے دروازے کھوئے، پھر گلیاں کھوئیں
پھر لوگ بھی کھو گئے
جس دن ماں کو چھپتے ہوئے دیکھا
میں چھپ گئی
تو میرے لہو کے سانس ختم ہوئے
میں اپنے باپ کی قبر پر
کتّا لکھ آئی تھی

ستیارتھی مجھے بیٹی نہ کہہ
کہ میں نے بکے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں
ابھی کپڑے
گندے اور گیلے ہیں
کونج، درخت اور چھاؤں
میرے بکتے ہی راکھ ہوئے
میرے ہنستے ہی گناہ ہوئے
ستیارتھی مجھے بیٹی نہ کہہ

مجھے میرے مرد کی طرح لگے ہو
کیا کہوں! لمحہ ہی کچھ کہہ گیا تھا
چھُپ جا لڑکی چھُپ جا
اس سینے میں

اس جوان میں
بیٹی دھوپ مجھے اپنی سانسوں کی طرح پیاری ہے
یہ جھُولا میں نے پہلی بار جھُولا ہے
کیا ہی اچھا ہوتا
اگر میری ماں تمھارے ساتھ ہنستی
تو میں جنم لیتی
اب ہاتھ ملاؤں کہ ہاتھ ملوں۔
سیتا رتھی مجھے بیٹی نہ کہہ
میری نیت پہ خود ہی ٹانکے لگ گئے تھے
یہ بیٹی دھوپ سے پہلے

میں آسمان کے ساتویں بُت کی بیوی ہوں

آیتوں کی سرگوشی ادھوری بات ہے
سُن !
آسمانی آوازیں میری قرض دار ہیں
اور میرے ایک آنسو کی موت پر
جنت میں میری قبر بنا ڈالتی ہیں
تم سوئے نہیں
بستی کا لہو سو رہا ہے
"کیا بستی کو کسی ماں کی بددُعا لگ گئی ہے"
ہاں !
کشکول میں پڑے ہوئے سکّے
مری ہوئی دعائیں ہو گئی ہیں
تم کون ہو ؟
میں آدم کے بچوں کی داشتہ ہوں
لیکن تم تو چاردیواری کے نام سے مشہور ہو
عورت کی قبر ہمیشہ بغیر کتبے کے ہوتی ہے
تو غار کا اندھیرا تیرے شکم سے کیسے ٹوٹا
میرے قدموں کو سجدہ کرنے کی عادت پڑ گئی تھی
آسمان کا ساتواں بُت

میری شرم گاہ سے اپنی محبت کی تکمیل کرتا تھا
اور میرے پستانوں سے اپنے نہروں کے سینے چوڑے کرتا تھا
اسے مٹی میں پیوست !
میری دھاروں سے روٹھے ہوؤ اور
میرے جسم سے سیراب ہونے والے
میرے بیٹو !

میں آسمان کے ساتویں بت کی بیوی ہوں

ڈھونڈتے ہو گلیوں میں میرا مکان
چار زخموں کے اقرار پر
میرا آٹھواں بت مت تراشو !!
یہ وقت شرم گاہوں کا نہیں
"آنکھوں کو انسان بنانے کا وقت ہے"

۳۰-۱۰-۱۹۸۰ء

جنم دن

آتش دانوں سے اپنے دہکتے ہوئے سینے نکال لو
ورنہ آخر دن
آگ اور لکڑی کو
اشرف المخلوق بنا دیا جائے گا....

کپڑے زندہ ہیں

ہم بھوک کی تمنا میں ٹھٹھرے ہوئے تھے
کہ سورج کے نیزوں پر ہماری صبح ہوتی ہے!!
ہاتھ تاپنے کی قسم کھائی تھی
اور آگ میں پرو دیئے گئے
اور گلیاں جب قسم کھاتی ہیں
اُنہیں چوراہوں میں پرو دیا جاتا ہے
پلڑوں پہ رکھے ہوئے پتھر بھی تُلتے ہیں
اور دوسرے پلڑے پہ پھول تولے جا رہے ہیں
نوکری کرنے کے شوق میں زندگی کی تنخواہ چاہتے ہیں
ہم کیسے رہن رکھے گئے زمینوں پر
بے خواب انسان دن گنتا ہے
کہ تم ہمیں سانس کے لوٹ آنے کی مہلت تک نہ دو
اور پوچھو!
تمہارے کپڑے زندہ ہیں
میں اپنی قبر کو سانس لیتے ہوئے دیکھ رہی ہوں
دریا سمندر سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اپنے ہاتھ کٹوا لیتا ہے
اور کھڑی زمین سوکھی ہو جانے کے غم میں

کھیتوں کا مزاج برہم کر دیتی ہے
اور وہ آنسو جو میرے مرنے کے بعد
میرے دامن کو تر کریں
انھیں ... انھیں آنکھوں میں رہنے دینا

اور تم!
گارڈ کے سفید پرچم زمینوں پر
کسی بھی وطن کی نشاندہی نہ کرو

انبار

کہاں سے آئے یہ ہاتھ
میں سراپا مار سکا لیکن یہ ہاتھ نہ مار سکا
مٹی پہ ان ہاتھوں کی پگڈنڈیاں بنا دو

اور
"ہتھیلیوں پہ بہت سی آنکھیں جھک گئیں"
ہتھیلیوں پہ دیکھنے والوں کے نام تھے
پُتلیوں سے کورے کاغذ گرنے لگتے ہیں
تو ہاتھ سے ہاتھ پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں

شاید مٹی مجھے پھر پکارلے

سُن ! دریا اپنی مُٹھی کھول رہا ہے
سُن ! کچھ پتے اور پتوں کے ساتھ کچھ ہَوا اُکھڑ گئی ہے
جنگل کے پیڑ ارادے زمین کو بوسہ دے رہے ہیں
چاہتے ہیں، دریا کو مُٹھی کا جال لگائیں
سُن !
گلی لے پر پھنکار رہی ہے
اس میں جلے ہوئے کپڑے پھینک
زینے گلیوں میں دھنسے جا رہے ہیں
جسم سے آنکھیں باندھ دی گئی ہیں
بہتے ستارے بتجھے عکس کر رہے ہیں
انھیں چہرہ کر لے !!
بتا !
جنگل سے لوٹنے والوں کے پاس میرے لفظ تھے یا مورت
کئی جنم بعد بات دُہرائی ہے
میری بات میں جاگ مت لگا
بتا !
بوجھل سائے پہ کتنا وزن رکھا گیا تھا
کیا موت !!

یہ چادر تمہاری آنکھیں نابینا چاہتی ہے
کنیچے اس چادر کو چھید چھید کر دیں گے
چادریں پہلے ہی سی کر لائی تھی
کیا پیمانہ زنگ آلود تھا
یہ چادر تمھیں مٹی سے دور رکھے گی
ایسی حد؟
ایسی حد سے میرا وجود انکار کرتا ہے
تمھارا وجود تو پرندے رٹ چکے
تمھاری زبان کہیں تمھاری محتاج تو نہیں
میرے اعضاء پہ اعتبار کر
میں حیرتوں کا انکار ہوں
مختلف رنگ کے چراغ
تلواروں کی مہکی مہکی نسلیاں زبان دکھا رہی ہیں
آدمی انسان ہونے چلا تھا کہ کنواں سوکھ گیا
کیا آدمی نے کنویں میں نفرت پھینک دی تھی
نہیں!
وہ صدا گنبد کو توڑتی ہوئی
تھوڑا سا آسمان بھی توڑ لائی تھی
چادر اور آواز کو تہہ کر کے رکھ دو
لوٹنے تک، میری آواز دھرتی پہ گونجتی رہے
جیسے جیسے تم جاؤ گے
ختم ہوتے جاؤ گے

تم دو آنکھیں رکھنا
مگر فاصلے کو بیدار مت کرنا
"آنکھوں کی ٹک ٹک سارا جنگل جانتا ہے"
تم خاموش رہنا
تو پھر زبان کا علم اپنے ساتھ لیتے جاؤ
تم پیڑوں اور چڑیوں کی گفتگو سننا
آبشاروں کے واز سہنا
میں یہ ٹکڑا آسمان کا رنگنے جا رہی ہوں
رخصت ہو رہی ہوں
آنے کا وعدہ ہے
وعدے چوکھٹ گھڑیاں جوڑ جوڑ کر بنائی گئی ہیں
وعدے کو کھڑاؤں مت پہناؤ
چاپ کا اقرار دیکھ میرے قدم کی رکھوالی کرتی ہے
میں اپنے چراغ کی لو سے تمھاری جھونپڑی باندھے جاتی ہوں
لو اور یہ جھونپڑی جس وقت اپنا دم توڑ دیں
تو سمجھ لینا
میں زندہ نہیں رہی ہوں گی
دیا تاریکیوں کو چوکنا رکھے گا
سانس تپ چکے
اور مٹی مجھے بلا رہی ہے
اچھا!
چراغ اور چادر کو باندھ دو

حیرت ہے!
تم حقیقت کی تیسری شکل نہیں دیکھنا چاہتے
آگ کو کوزے میں بند کردو
اور یہ رہا چراغ اور چادر
یہ تو راکھ ہے؟
"یہ راکھ نہیں میرے سفر کی گواہی ہے"

توبہ دے ٹانکے (ترجمہ)

۔۔۔۔ تو نے توبہ کی اینٹوں سے اپنی دیوار بنائی
پھر توبہ اور نیکی کے بازار میں بکتا ہے
اور غیب کے پتھر ہمیں اُٹھانے پڑے
۔۔۔ نے اپنی قربان گاہ کو انسان کے صبر سے رنگا
اور
ہماری عزتوں کی دھجیوں سے اپنی چادر بنائی
انسان کے سات گناہ گِنے
اور سات آسمان بنائے
گنہگاروں کی نیکیوں سے اپنے کپڑے سلوائے
جیسے بخشتا عزتوں کے گلاب
اسی کی شاخ پر لگا دیتا ذلتوں کے کانٹے
میں نے کانٹوں کی جھگی بنائی کہ پھولوں کے پاس صبر تھوڑا ہوتا ہے
میں نے بسم اللہ پڑھ کر ۔۔۔۔۔۔۔۔ آیت نہیں پڑھی
۔۔۔ کا مزاج پڑھا
اور اپنے لباس سے توبہ کے ٹانکے کھول دیے

کہ ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے
آسمانوں کے انتظار سے
مجھے انسانوں کے انتظار میں خسارہ نہیں
اور تو کہتا ہے کہ ہر دور کا انسان خسارے میں ہے
ہم سچے سیارے اپنے گھر نہیں رکھ سکتے
کہ اب انسان کے گھر انسان پیدا ہو رہا ہے
تو اندھوں کی مزدوری کہاں رکھتا ہے
اپاہج بچوں کے قصور ہیں کون سی حدیث سناتی ہے
اے رب!
اگر تو اپنے اجر زرخیز کر لے تو میری مٹی بھی بنجر نہیں
اے رب!
تو نے آنکھیں اس لئے بانٹیں کہ انسان آسمان کی طرف دیکھتا رہے
مانا کہ تیری مٹھی انسان کی قبر سے بڑی قبر ہے
مگر روٹی کبھی کبھی دوزخ کی آگ پر بھی پکانی پڑ جاتی ہے
تو ایک سے دوسری بات نہیں کر سکتا
کہ تو ایک ہے...
غیب کا سارا ورق انسان لکھ رہا ہے
کہ علم تیرے ورق پر لکھا جائے
کہ ہمارے علم سے منکر نہ رہ سکے
شہیدوں کی تلواروں سے میرے بچے لکھیں گے
غائب کو سجدہ تو کافر بھی نہیں کرتا

سارا شگفتہ ۱۹۸۳ء

بیٹے کے لیے ایک نظم

جب میری مٹی تمھیں دیکھتی تھی
اور بیج کا درد میرے پاس تھا
تمھارا موزا کھیتوں میں اگ چکا تھا
میرے پاؤں پر مٹی بھاری ہوئی
اور میری خوشبو پھولوں میں پڑ گئی
دریا جنگل چرا لائے
تو چھاؤں میں نے بچھا دی
سرگوشیوں میں پھول اُگے
مٹی میرے گھر مبارک باد دینے آئی
پھول اور ستارے
کیاری کا دل دھڑکا رہے تھے
شاخیں مٹی کو چومتیں
میں نے ایک پیڑ تراشا
اور تیرا جھولا بنایا
خبر تھی
شاخوں کے لئے کوئی پیڑ نہ رہے گا
اور

پرندے مٹی پر بسیرا کر بیٹھے
مٹی نے گھونگٹ نکالا
تو قبر نے مجھے ماں کہہ دیا
یہاں گندم کھلانے والی عورت ماں تھی
وہ بے خواب سا
جانے کہاں سے چلا تھا
ہم زمین پر مل گئے تھے
خدا نے اس کا نام آدم رکھا
میں اور بیٹا
ہم دونوں تنہا تھے
وہ معصوم تھا اور میں خوش
میں نے ساری دیواریں پاٹ ڈالیں
اور کیاری میں ہاتھ بو دیئے
میرے ہاتھوں سے ہاتھ جاتے رہے
مجھے کیا خبر تھی
مٹی ہوئی چیزوں سے بھی کچھ چھین لیا جاتا ہے۔
چاند داغ سہتا آیا ہے
مجھے مٹی کا الزام سہنا تھا
اب بچے کی ہنسی میں
جذبے بس چکے تھے
مجھے اپنے جذبے مہکتے دکھائی دیتے
پتھر لہو میں پڑ رہے تھے

اور میں چھلک رہی تھی
تنہائی سا خوف ہمیشہ میرا پیچھا کرتا رہتا
انجانے سمندر میں
میں نے کشتیاں چھوڑ دیں
موزے مٹی میں کہیں کھو گئی تھی
جب اندھیرے میں چراغ کھو گیا
اندھیرے میں
میری سانس اٹکی ہوئی تھی
میں نے اُمید کے چراغ سے
رسی جلا ڈالی
اور اپنے ٹکڑے کی چھاؤں بن بیٹھی
ستارے ٹوٹ رہے تھے
اور میرے بچّے کی عمر گھٹ رہی تھی
خوف نے میرے بال کھول دیے
تو
میں نے اپنی مانگ کا نام بیٹا رکھا
دو سال ہاتھوں میں بیت گئے
چوتھے سال میرا بیٹا
راستے کی طرف اشارہ کر سکتا تھا
سسکتی شام میں، میں سویٹر بُن رہی تھی
کہ پانچ گھر گر گئے
بان جیسے زندہ ہو گیا ہو۔

اور میں مُردہ
تمہارا کون سا نام ہے
میرا نام تو بیٹا ہے
شام نے قہقہہ لگایا
اور چاند کو اشارہ کر گئی

میں اکثر بیٹے کو دوپٹے سے ڈھانپ دیتی
اس کی نیند میں سارا آنگن گھوم آتی
دیوار گر گئی تو بے پردگی ہو گی
لیکن یہاں تو ماں رہتی ہے
ماں کا جسم اور خوبصورت ہو جاتا ہے
میرا بیٹا سو رہا تھا اور میری گڑیا جاگ گئی تھی
شام نے پھر چٹکی بجائی
اور میرا بیٹا کچھ خرید لایا
ابر کا سانپ
میں سچے لہجے میں چلائی
بیٹا زہر
یہ زہر تو مصنوعی ہے ماں
اور میرے بچے کی شرارت پانچ برس کی ہو گئی
ایک دن سورج کی سلاخوں پر
کپڑے سکھا بیٹھی
انجانے خوف نے آگ پکڑ لی
بیٹے نے لفظ گوش گزارے

الف سے اللہ میم سے ماں
میں نے لفظ کو ٹھنڈا کیا
اور کہا
میم سے محمدؐ
آپ کیوں رو رہی ہیں
بہت سی منوّر چیزیں رو رہی ہیں
آپ کھو سی جاتی ہیں
کھونے کا لفظ نہ دُہرانا بیٹا
نہیں تو ربر کا سانپ
زندہ ہو جائے گا
چاند نے آدھی بات کہی
اور صبح ہو گئی
زمین نے مجھے کہا ماں
اور میری آنکھ آسمان ہو گئی
ماں تم خوفزدہ کیوں رہتی ہو
جتنے پورنے ڈالا کروں
اتنی ہی تختی لکھا کرو بیٹا
گیند کبھی دیواروں کو چھوتی
کبھی مٹی کو چھوتی
گیند بہت شور مچاتی ہے بیٹا
اور خوف میرے بال کھول رہا ہے
گیند سے کس ماں گھر ٹوٹے ہیں

لیکن
وقت گیند کو ضرور توڑتا ہے
آپ تو انجانے میں ٹھنڈی ہو رہی ہیں
میں کس کے پاس سوؤں گا
اندیشوں میں کبھی مت جاگنا
اور نہ مٹی کی طرح
چھاؤں کے کپڑے پہننا
ماں اور مٹی موسم سے زرخیز ہیں
دُکھ زرخیز نہ ہو جائیں
خاک کو آگ کی بددعا ہے
مجھے دعا مانگ لینے دے
میرے ہوتے ہوئے تم
دعا کیوں مانگ رہی ہو
سورج آسمان کے تلوے چاٹ رہا ہے
کہیں تمھیں نظر نہ لگ جائے
پھولوں کے پاس مت جایا کرو
کیا میری ماں کائنات کی قید میں ہے
فکرِ انسانی کے موڑ پہ ہوں
اور علم میری قید کاٹ رہا ہے
کڑیاں پہلو میں سوتی ہیں
سمندر کی سطح کھلتی ہی نہیں
گناہ کی پشت دیکھ رہی ہوں

چراغ محو ہے انسانوں میں

میں اپنے ہی کھلونے سے ڈر گئی تھی

جلی رسیوں پہ نقش پا ٹھہر گیا

اور فاصلے پہ آنکھ مر گئی

ماں کے لفظ پر

زمین ختم ہو جاتی ہے

تو میں کہاں کھیلوں گا

ستارے تو آسمان سے کھیل رہے ہیں

میں کپڑے دھوتے ہوئے چلائی، سوئی !

سوئی سے آواز آئی ماں

میں اُسے سینے سے لگائے سمجھی

یہی [illegible] ہے

ستارے گننے سکھائے تھے

کیا خبر تھی

کل اُسے دیواریں گننا سکھا دیں

اس کی آنکھوں میں ماں کی خبر تھی

پھر سمندر نے کروٹ لی

جب منور چراغوں سے میرے دوپٹے میں آگ لگی

میرا بچہ آگ سے ڈر گیا

میں خود سے چھپی اُسے لپٹاتی

تو خالی چادر ہاتھ آتی

میں انگاروں پہ لوٹ جاتی

لیکن وہ آگ سے ایسا ڈرا
کہ دو برس بیت گئے
رات میرے ساتھ روتی
میری آہ پر لوگ قرآن پڑھتے
مجھے دیکھ کر
ماؤں کے سینے سے دودھ بہنے لگتا
اور جب بھی بیٹا کہتی
میرے پستانوں سے دودھ بہنے لگتا
دعائیں پتھر ہو کر لہو میں دوڑتیں
ہاتھوں کے کتبے اپنی قبر ڈھونڈ لیتے
خاموش قبریں بھی چلا اُٹھتیں
بیٹے اور ماں کے درمیان
کوئی انسانی کڑی کھُل جائے
تو بیٹا! میرا لباس کڑی رہ جائے گا
کنکر سے مکالمہ مت کرنا
میری کتابیں پڑھنا
آگ سے ڈرے ہو
میری روح سے مت ڈرنا
کہ روح کا دوپٹہ منور چراغوں سے
نہیں جلتا
جانے آج تم نے کون سے کپڑے پہنے ہوں گے
جانے آج دُکھ

تمھارے گھر کتنی دیر ٹھہرا ہوگا
تمھاری شرارتوں سے کیاریاں بھر گئی ہوں گی
تمھاری آواز
میری آنکھوں جیسی ہوگئی ہوگی
تمھاری ہنسی مجھ سے مکالمہ کرتی ہوگی
آ تیرے کپڑے دھو دوں
اور تیری گیند کا
ایک آنگن اختیار کر کے تمھیں دے دوں
تمھاری پور سے کانٹا نکالتی
اور کسی بھی تہوار پر
ہر خالی ہاتھ تمھیں دے دیتی
تیری شرارتوں سے جوان ہو جاتی
پھر میں نے قدم طے کیے
اور تیری دیوار کے ساتھ کھڑی ہوگئی
دیوار سانس لینے لگی
اور تیری دیوار کے ساتھ کھڑی ہوگئی
دیوار سانس لینے لگی
تم سامنے تھے
لیکن دروازہ بند تھا
جیسے آواز مجھ میں مر گئی ہو
اور آنکھوں نے تجھے گود لے رکھا ہو
مجھے انسانوں کی بھوک لگی

تو کپڑوں نے فاقہ قبول کر لیا
بانسری پیڑ کو لوری سناتی
خدا نے کب دُعا مانگی
کالی کملی تو میری کالی دُعا ہے
سائے ٹل گئے تو دھوپ کی پیدائش کہاں
راہوں کی پہیلی دیکھ کیسے انکار کرتی ہے
اور وقت نے انسانی کشکول چُن لیا
تم سفید پھول لائے
اور کہا ماں !
سفید پھول تیرے باپ کے گناہ سے
کالا پڑ گیا ہے
منور چراغ میری خالی گود میں
کینچلی بدلتا رہا
میرا دوپٹا کراہتا
اور چراغ رقص کرتے
پھر آہوں کی بیلوں سے
میں نے گھر بنا لیا
میری رات میں چراغ پھنکارتے
اور میرے کفن کو بھی گالی دے گئے
میرے پیڑ پہ نہ شام آئی نہ پرندے
سیاہ آنکھوں والی عورتیں
رات کی قیدی تھیں

ان کے نیند میں چلتے ہوئے بچّے
انہیں اتنا جگا جاتے
کہ یہ رات میں مر جاتیں
پھر میں دیپ لے کر کبھی جنگل نہ گئی
میں کوڑے کے ڈھیر سے
آنکھیں اُٹھا اُٹھا کر پڑھا کرتی
مٹی پہ پہاڑ قدم رکھے
میری روانی دیکھتے
اتنا سناٹا ہوا
کہ پتھروں پر لوگ کتبے لکھنے لگے
میری آنکھیں دعا بن گئیں
دعا بھی ایک الزام ہے
میرے بوڑھے موسم مجھے تراشتے
میں بچے سنگریزوں سے تمھارے کھلونے بناتی
کھلونے باعمر ہوئے اور مجھ سے باتیں کرتے
میں نے نئی زبان دریافت کی
اور بچّوں والیوں سے کہا
تم دیواروں کی ماں ہو
اور میں صدیوں کی ماں ہوں
میرے لہو سے تمھاری صدائیں آتی ہیں
خاموشی زندہ ہو گئی ہے
جہاں دل علم ہو جائیں

وہاں سمندر میں دریا خاموش ہو جاتے ہیں
ہر سنگِ میل پر لکھا ہے کون جانے
میں تمہیں ڈھونڈنے نکلی تو قدم کھو گئے
عشق کے درمیان مٹی رہتی ہے
اب میرے قدم کے ساتھ فاصلہ رہتا ہے
میں نے خاموش گناہ کیا اور پیدا ہو گئی
تم نے خاموش گناہ کیا
اور ماں سے جُدا ہو گئے
خدا اور ہاتھ میں دُعا سی زنجیر ہے
اور میں زنجیر جتنی بیدار ہو چکی ہوں
میں دُعاؤں کی داستان ہوں
میرا ہر لباس
چراغ ہی سے جلتا ہے
تم تو مجھے ایسے دیکھ رہے ہو
جیسے میں نے انسان کو جنم ہی نہیں دیا
انسان کے ساتھ ایک دیوار رہتی ہے
آؤ ہم
دیواروں کے ظرف سے ایک گھر بنائیں
میرا رب دُکھ سے بھی اعلیٰ ہے
میں تڑپی
تو سمندر کے کنارے تنگ پڑ گئے
میں ایسا پیڑ ہوئی

جس کا تابوت بنا بن لاشہ
میری آنکھیں ہاتھوں میں رہنے لگیں
میرے پاس پھر بھی ایک آسمان رہ گیا
عورت ماں ہو جائے
تو خدا اس کا دوست ہو جاتا ہے
انسانی دکھ تیرا لباس ہو
اتنا ہوا
میں نے ساری اداس عورتیں دیکھ لیں
انگار تیری خواہش ہو
انسانی آنکھ تیرا جسم ہو
تیری عورت تیرا انصاف ہو

سارا

بنام سارا

میری سارا ! آج میری کھڑکی میں چڑیاں چہچہا رہی ہیں اور میں جان گئی ہوں کہ آج تیری سالگرہ ہے ...... تو نے مجھ سے خود کہا تھا کہ کسی پرندے کا چہچہانا ہی تیرا جنم دن ہے. جانتی ہوں ، یہ زمین اس قابل نہیں تھی کہ تو اس پر اپنا گھر تعمیر کر لیتی اس لیے تو نے اپنی قبر تعمیر کر لی.

لیکن سارا ! تو قبر بن سکتی ہے ، قبر کی خاموشی نہیں. تیری قبر سے کان لگا کر جب بھی کوئی سننا چاہے گا ، وہ تیری آواز سن سکے گا کہ تلاوت کے لیے میں انسانی قرآن چاہتی ہوں ، پتہ نہیں انسانی قرآن ، اس دنیا میں کب لکھا جائے گا لیکن جب تک نہیں لکھا جاتا ، تو اس دھرتی کا ضمیر بن کر دھرتی کے ہر انسان سے کہتی رہے گی کہ تلاوت کے لیے انسانی قرآن لکھو !

انسانی قرآن کی ایک آیت جیسی سارا ! اگر آج کی نہیں تو کل کی ادبی تاریخ ضرور گواہی دے گی کہ اس قرآن کا الہام تجھے ہوا تھا اور تو نے چاند اور سورج کی دو دواتوں میں قلم ڈبو کر اسکی پہلی آیت لکھی تھی .

تو دنیا بھر کے شاعروں کے آگے خالی کاغذ بچھا گئی ہے. اگلی آیتیں لکھنے کے لیے ...... اور دنیا میں جب تک پرندے چہچہاتے ہیں ، وہ دنیا کے شاعروں کو انکے ضمیر کی طرح کہتے رہیں گے کہ یہ انسانی آیت جیسی سارا کا جنم دن ہے ..... دیکھ !

امروز نے اپنے گھر کی دیوار پر چڑیوں کے سات گھونسلے بنائے ہیں تاکہ وہ دن بھر لکڑی کے ان گھونسلوں میں اپنے تنکے جوڑتی رہیں، دانہ چگتی رہیں اور چھوٹے چھوٹے پروں کے ساتھ اڑتی، بیٹھتی، چہچہاتی رہیں اور روز کہتی رہیں کہ آج سارا کا جنم دن ہے۔ آج انسان کے ضمیر کا جنم دن ہے۔.........

امرتا

پڙهندڙ نسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪَ ”لُڙهندڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياجوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوُٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعوىٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، ٻَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. ٻين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصيِ ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَ پاران ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي ڪُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٺاندڙ وڏِ
کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽
ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ
کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ،
پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سِپني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ
جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اٽڪاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ
”هاٽي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ
وڃايو“ ناداني ءَ جي نشاني آهي.

پَڙهڻ جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪچي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَڙهَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نَسُل جا پَڙهَ سيني کي **چو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽل گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ ٻڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪِي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)